نومبر ۱۹۶۴ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

نگار

پاکستان

قیمت فی کاپی

۷۵ پیسے

دس روپے

جلد ۴۳ نمبر ۱۱
Jild 43-11
199664

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

مومن نمبر

(مرتبہ:- نیاز فتحپوری)

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اسکا صحیح اندازہ

"مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا،

اس نمبر میں مومن کی سوانح۔ حیاتِ معاشقہ۔ اس کی غزل گوئی۔ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہوگیا ہے کہ اس نمبر کو نظرانداز کرکے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔ قیمت:- چار روپے

منیجر نگار پاکستان * ۳۲ * گارڈن مارکٹ * کراچی ۳

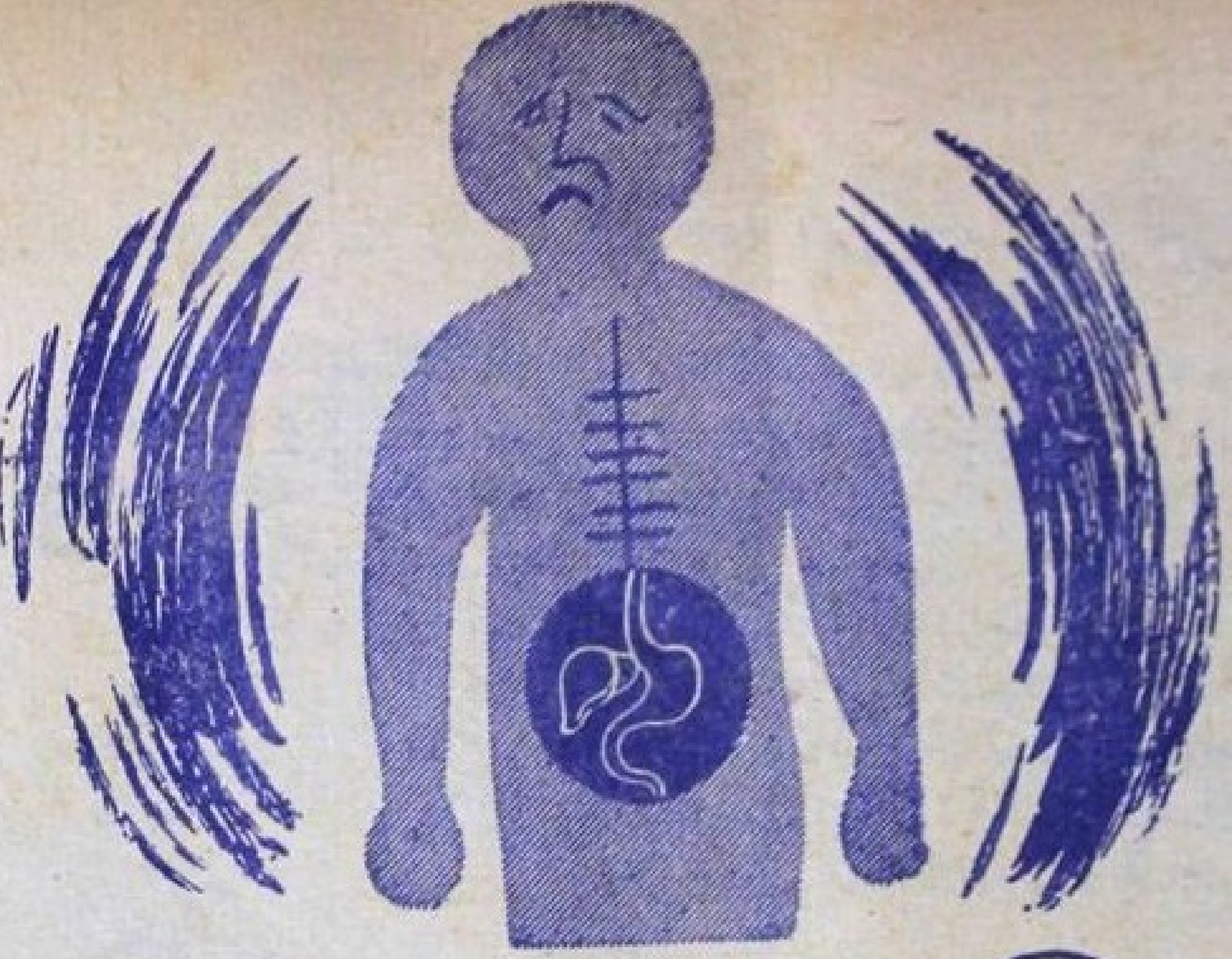

ہاضمہ خراب ہو تو
صحت کیوں کر ٹھیک رہے!

معدہ، جگر اور آنتوں کے افعال صحیح نہ رہیں تو ہاضمہ بگڑ جاتا ہے اور صحیح و صالح خون بننا بند ہو جاتا ہے جس سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ سُستی، طبیعت کا گرا گرا رہنا، پژمردگی، چہرے کی زردی، منہ کا مزا بگڑ جانا اور قبض سب اس کی نشانیاں ہیں کہ آپکا ہضم خراب ہے۔ کارمینا ایسے حالات میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

کارمینا نہ صرف معدہ، جگر اور آنتوں کو طاقت دیتی ہے بلکہ ان کے قدرتی افعال کو بحال کر دیتی ہے۔ آپ کچھ ہی کھائیں کھانے کے بعد کارمینا کی ٹکیاں بہترین ہاضم کا کام دیتی ہیں۔ اس کے استعمال سے بدہضمی، قبض، بھوک کی کمی، پیٹ پھولنا، معدے میں گیس اور سینے کی جلن جیسی تکلیفیں پیدا نہیں ہوتیں۔

کارمینا

معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھئے

ہر کیمسٹ ڈرگسٹ اور جنرل اسٹور پر ملتی ہے۔

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

H.C. 4/1113 united

U
070
M65 N-11
1961

ایک کشمیری خاندان

آج سے سولہ سال پہلے ..... یہ شخص ایک نوخیز جوان تھا اور اپنے باپ کے ساتھ منگلا گاؤں میں جہاں جدید وسائل نام کو بھی نہ تھے، بڑی باشقت زندگی گذارتا تھا۔ حالانکہ آج اس کا گاؤں اُجڑ کر زیر آب آگیا ہے لیکن پھر بھی یہ خوش ہے۔ اسے ایک نیا گھر ملنے کی توقع ہے جسمیں بجلی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ کاشت کیلئے بہترین زمین ملیگی اور آبیاری کیلئے وافر پانی۔

منگلا بند کی تکمیل پر اس سارے علاقے کیلئے برقابی قوت اور پانی کا ایک بہت وسیع ذخیرہ مہیا ہوجائیگا جو ملک کی مادی ترقی اور اس کے درخشندہ مستقبل کا ضامن ہوگا

برماشیل کو اس بات پر فخر ہے کہ اس بند کی تعمیر میں کام آنے والی تیل کی تمام مصنوعات وہی فراہم کر رہی ہے اور اس طرح پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کیلئے ایک انتہائی اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔

اعلیٰ خدمت
اپنا شعار

برماشیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لیمیٹڈ۔ (انگلستان میں قائم شدہ، کمپنی کے ممبران کی ذمہ داری محدود)

KITMER
DSP-56

آسٹر ملک کا زمانہ
مسرّتوں سے بھرپور ہوتا ہے

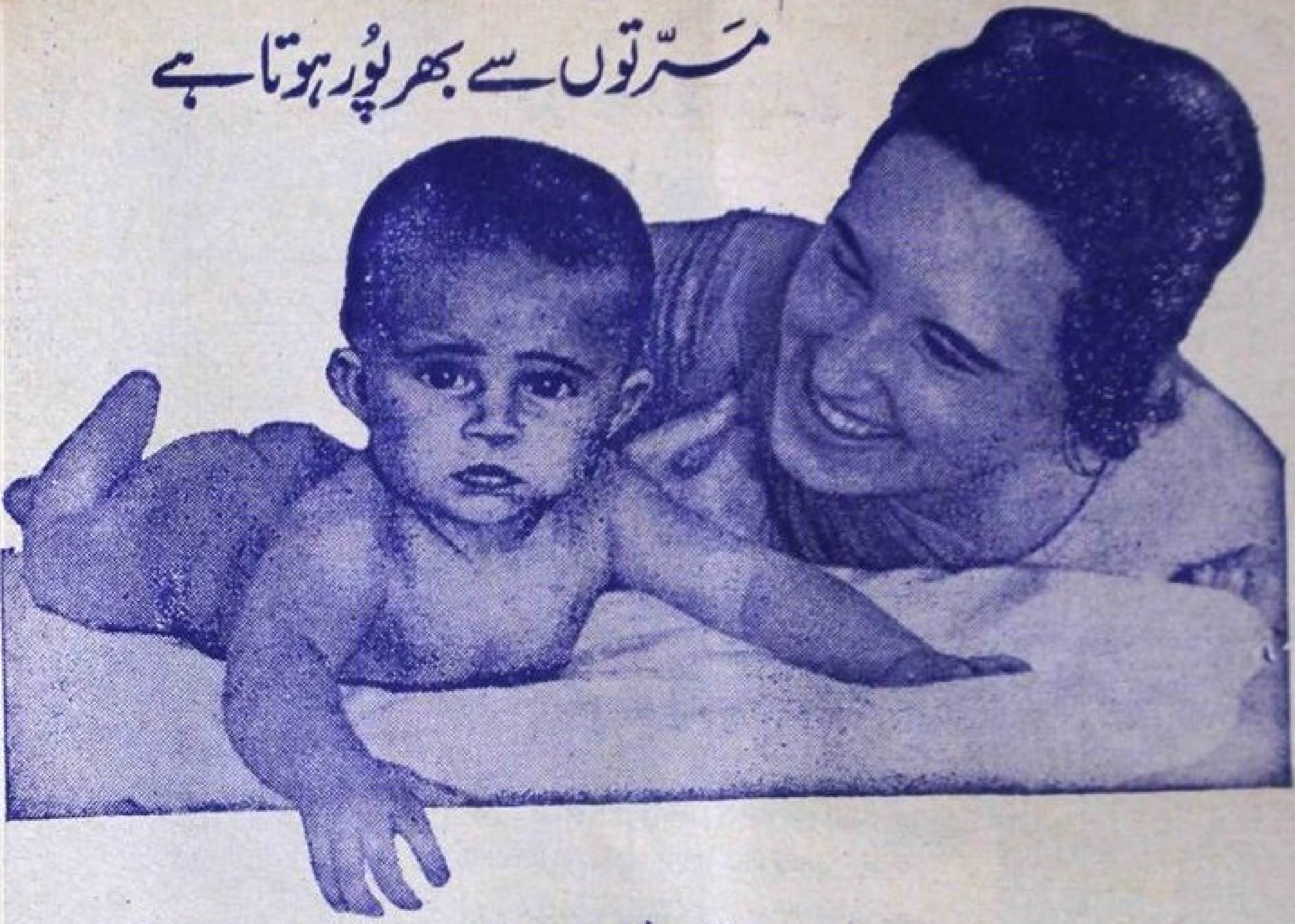

وہ زمانہ جب بچے کی پرورش آسٹر ملک پر ہوتی ہے ماں اور بچے دونوں کے لئے مسرّتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ آسٹر ملک بچے کو تندرست اور خوش و خرّم رکھتا ہے جس سے ماں بھی مطمئن اور مسرور رہتی ہے۔

آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچوں کے جسم میں خون کی کمی نہ ہونے پائے۔ ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بنانے کے لئے وٹامن ڈی بھی مناسب مقدار میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے دودھ چھٹ جانے یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے دانشمند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں۔
جی ہاں! آسٹر ملک بچے کی صحت اور مناسب نشوونما کے لئے مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے۔

آسٹر ملک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

اب آسٹر ملک "ہاف کریم" بھی دستیاب ہے

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
آسٹر ملک کی کتاب اردو میں دستیاب ہے۔ ذیل کے پتے پر ۔ھ نئے پیسے کے ٹکٹ محصول ڈاک کے لئے بھیج دیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
پوسٹ باکس نمبر ۳۶۷۳۔ کراچی ۲

OM-14-103-UD

قدیم روایات
اور
جدید وضع کی
آئینہ دار
ڈبلیو۔پی۔آئی۔ڈی۔سی۔کی
گھریلو مصنوعات
خریدیئے
ڈبلیو۔پی۔آئی۔ڈی۔سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت ملبوسات
کھلونے۔آرائشی پارچہ جات۔تحایف یا دوسری زیب و زینت کی
چیزیں آپکے گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔یہ مصنوعات
اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا
انتخاب کیجئے۔
مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
مرکز:
پاکستانی
گھریلو مصنوعات
پریڈی اسٹریٹ اور کچہری روڈ۔کراچی۔ دی مال لاہور۔ دی مال راولپنڈی۔ حسن پروانہ روڈ۔ ملتان
دی مال پشاور۔تلک چاوڑی حیدر آباد۔ جناح ایوینیو۔کوئٹہ

رجسٹرڈ نمبر ایس — ۲۲۷۲

ٹیلیفون نمبر ۳۶۹۳ء۷

نومبر سنہ ۱۹۶۴ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری — عارف نیازی

زر سالانہ — قیمت فی کاپی

دس روپے — پچھتر پیسے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی-/ الیف-یوپی-بی ۳۶۶۹-۶۸/۶۲ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر-پبلشر-ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا
چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہوگیا

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ ———— نیاز فتحپوری

۴۴ واں سال	فہرست نومبر ۱۹۶۴ء	شمارہ (۱۱)

ملاحظات ———— نیاز فتحپوری ———— ۳
مولوی البرامکہ ———— کوثر چاندپوری ———— ۷
تاریخ اسلام میں غلاموں اور کنیزوں کی اہمیت ———— نیاز فتحپوری ———— ۱۶
لکھنؤ ———— محمد عمر ———— ۲۰
دریائے عشق اور بحر المحبت (تقابلی مطالعہ) ———— فرمان فتحپوری ———— ۳۲
پاسِ عہد ———— فسانہ ———— نیاز فتحپوری ———— ۴۲
حضرت عائشہ کی عمر وقت ازدواج ———— تمنا عمادی ———— ۴۹
سرور جہان آبادی ———— محمد یونس خالدی ———— ۵۷
باب المراسلہ والمناظرہ { برق لامع اور غالب } ———— نیاز فتحپوری ———— ۶۵
باب الاستفسار ———— ۱- سعدی کی تاریخ پیدائش و وفات
۲- ایران پارسی
۳- حسرت کے دو شعر
۴- مثنوی یوسف زلیخا
۵- بعض تذکروں کا سال تصنیف
۶- میر جملہ
———— نیاز فتحپوری ———— ۶۷
منظومات ———— { فضا ابن فیضی، وامق عظیم آبادی، شفقت کاظمی، فضا جالندھری، جمیل مظہری } ———— ۷۴
مطبوعات موصولہ ———— نیاز فتحپوری ———— ۷۷

ملاحظات

انقلابات ہیں زمانہ کے

یہ دُنیا جو بظاہر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نظر آتی ہے اس سے قبل خُدا جانے کتنے ذہنی انقلابات اس میں آ چکے ہیں، لیکن سب سے بڑا انقلاب جس کو ہم محسوس ہی نہیں کرتے یہ ہے کہ دُنیا ہر آن بالکل نئی ہو جاتی ہے غور فرمائیے کہ اب سے ایک یا ڈیڑھ صدی قبل کا کوئی حیوان یا انسان اس وقت موجود نہیں یعنی جو دنیا ۱۸۶۳ء میں تھی اس کا کوئی فرد ۱۹۶۴ء میں باقی نہیں۔ اور چونکہ دُنیا ہر ہر لمحہ ایک صدی ختم کر لیتی ہے، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہر لمحہ بالکل نئی ہو جاتی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔۔۔ لیکن فنا و بقا کا یہ قدرتی نظام اس طرح تدریج کے ساتھ جاری ہے کہ ہم اس کو محسوس نہیں کرتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمانہ اپنی جگہ ٹھہر گیا ہے۔۔۔ اس لئے جب ہمارے توقعات کے خلاف کوئی نئی بات ہو جاتی ہے تو ہم اس پر تعجب بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف ہنگامہ و شورش بھی۔

کون کہہ سکتا تھا کہ:-

(۱) سوویت روس کا بطلِ اعظم "خروشیف" کا نام دُنیائے سیاست سے دفعتاً یوں محو ہو جائے گا، گویا اس سے پہلے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

کسے خبر تھی کہ:-

برطانیہ کا کنزرویٹو اقتدار جو مسلسل تیرہ سال سے وہاں کی مستحکم بنیاد ہو کر رہ گیا تھا چشم زدن میں ختم ہو جائے گا اور ایک مزدور کے سپرد کر دیا جائے گا۔

کسے خیال ہو سکتا تھا کہ:-

چین جو ایٹمی آلات کی طیاری اور ان کے تجربات کو انسانی جرم سمجھتا تھا وہ خود اس جرم کا مرتکب ہوگا اور دنیا کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کر دے گا۔

لیکن یہ سب کچھ ہوا، بالکل خلاف توقع ہوا، اور اب ہم اس پر رائے زنی کر رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان زمانۂ حال کا بندہ ہے، حالانکہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دراصل غلام ہے مستقبل کا۔ وہ آج کوئی قدم ایسا نہیں اُٹھاتا جس کا تعلق آنے والے کل سے نہ ہو، وہ آج محنت کرتا ہے اس لئے کہ کل اس کا پھل اُسے ملے گا، وہ آج دولت جمع کرتا ہے اس لئے کہ کل اس کی اولاد اس سے مستفید ہوگی اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنی راہ عمل متعین کرتا ہے ۔۔۔ جس کے مختلف نام اس نے رکھ چھوڑے ہیں۔ فی الحال ان میں ایک کا نام جمہوریت ہے، دوسری کا اشتراکیت۔ اس وقت دُنیا اکھاڑا ہے انہیں دو قوتوں کی زور آزمائی کا ۔۔۔ نتیجہ کیا ہوگا اس کی خبر کس کو ہے، لیکن جس حد تک ذہن انسانی کی جنگ جوئی کا تعلق ہے، صرف ایک بات

زیادہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں کا اختلاف کبھی ختم ہونا نہیں، اور اگر کبھی ہوا بھی تو اس کی صورت صرف یہ ہوگی کہ نہ یہ باقی رہیگی نہ وہ، اور دنیا ایک بار سنسان اور ویران ہو کر پھر اسی منزل پر لوٹ جائے گی جہاں سے اول اول اس کی تمدنی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ بہ ظاہر بہت عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن ذہن انسانی کے موجودہ رجحان کو دیکھ کر ہر شخص اسی نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہے۔ دنیا کی موجودہ علمی پرواز سے انکار ممکن نہیں، (میں نے اسے پرواز کہا ہے، ترقی نہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں میرے نزدیک بڑا فرق ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو وہ کیا ہو سکتی ہے۔

فرض کیجئے کہ انسان پرواز کر کے چاند، مریخ، یا کسی دوسرے سیارہ تک پہونچ بھی گیا تو وہ کیا کرے گا۔ یہی نا کہ وہ وہاں پہونچکر ان سیاروں میں اپنے مارکٹ پیدا کریگا، وہاں کی آبادی کو اپنا محکوم بنائے گا اور عیش و مسرت کی نئی نئی راہیں پیدا کرے گا۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب وہ ان سے بھی تھک جائے گا اور پھر کوئی دوسرا قدم نیا اٹھائے گا۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس کا تعلق اس عجوزۂ کہن سال کرۂ زمین سے تو ہوگا نہیں کسی اور دنیا سے ہوگا اور آخر کار جب اس کی قوت پرواز ختم ہو جائے گی (جس کا ختم ہو جانا یقینی ہے) تو وہ پھر اسی خاک دان میں آکر گریگا جہاں سے اس نے پرواز شروع کی تھی، اور آخر کار یہاں کی کہنگی و فرسودگی سے بیزار ہو کر خود کشی کرے گا۔

ہم کو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ عہد حاضر کا ترقی یافتہ انسان اپنی جگہ بہت مطمئن ہے۔ عیش و مسرت، لطف و سرور، سکون و فراغ کی تمام ممکن صورتیں اسے میسر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کا فلسفیانہ مطالعہ کیا ہے، ان سے پوچھئے کہ وہاں کیا حال ہے۔ دولت کی کوئی انتہا نہیں (وہی دولت جو عیش و فراغ کے لئے جمع کی گئی تھی) لیکن سکون قلب مفقود ہے۔ ذرائع لطف و تفریح بیشمار ہیں، لیکن حقیقی مسرت کا کوسوں پتہ نہیں۔ انھوں نے اپنے ذہن کی قوت اور زور بازو سے تو وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو اس مادی دنیا میں حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ اپنے دل کو اب تک ان سے مالوف نہیں کر سکے —— خدا نے انسان کو انسان پیدا کیا تھا، شیطان نہیں، لیکن اس نے شیطان بننا زیادہ پسند کیا اور وہ شیطان ہو گیا، لیکن کب تک؟ آخر کار جب وہ زندگی کے تمام ملاہی و ملاعب ختم کر چکا اور ان سے جو لذت و آسودگی میسر آ سکتی تھی، وہ سب کی سب اسے حاصل ہو چکی، تو پھر اس میں ذہنی رد عمل پیدا ہوا اور اس کو پھر وہی انسان یاد آنے لگا جس سے وہ کسی وقت بیزار ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اس کھوئے ہوئے انسان کو کس طرح دوبارہ پا سکے یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور اگر آ بھی جائے تو وہ اس پر قادر نہیں، کیونکہ جو نیا غیر انسانی معاشرہ وہ پیدا کر چکا ہے، اس کا بدلنا اس کے اختیار سے باہر ہے اور اسے موجودہ نسل کے ساتھ ہی ختم ہونا ہے —— یورپ کا انسان اب اچھی طرح سمجھنے لگا ہے کہ اس نے فطری اقدار سے ہٹ کر اپنے اوپر کتنا ظلم کیا ہے، وہ بخوبی واقف ہے کہ اس نے معیار اخلاق بدل کر کتنی بڑی غلطی کی ہے، لیکن اب وہ لوٹ کر جائے کہاں اور کس طرح، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اوّل اوّل جب اس نے ترقی کی طرف قدم اٹھایا تو سب سے پہلے اپنی شریک زندگی سے کہا کہ "بیوی، میں تو چلا، اب تم جانو اور تمہارا کام" بیوی نے یہ سن کر بچوں سے کہا کہ "تمہارا باپ تو گیا، اور اب میں بھی آزاد ہوں جو چاہوں کروں، تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو" بچوں نے یہ سنا تو وہ خوش ہو گئے۔ لیکن تیتریوں اور پتنگوں کی خوشی ہی کیا، شیطان نے انھیں پکڑ کر مسلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر کا انسان ابھرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا، اور وہ بالکل شیطان کے غلام ہو گئے۔

یہ تھا آغاز اس اخلاقی انارکی کا جس کے نتائج پر تو مغرب کے انسان نے نظر نہیں کی، لیکن جب وہ سامنے آ گئے تو کفِ افسوس مَل رہا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

آج ہم مغرب کی زندگی پر غبطہ کر رہے ہیں، وہاں کی مادی ترقیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی تقلید میں وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو وہ کر رہے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ ان کے اتباع سے جو ذہنی انحطاط ہم میں، ہمارے بچوں، اور ہماری عورتوں میں پیدا ہوتا جا رہا ہے، وہ دراصل پیش خیمہ ہے اسی اخلاقی سراج کا جس نے مغرب کی عائلی زندگی کو تباہ کیا اور اب ہم بھی اسی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔

معاف فرمائیے خیالات کی رَو میں خدا جانے میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا، اصل مدعا تو اُس سیاسی و ذہنی کیفیت پر نظر ڈالنا تھا جو حال ہی میں روس، برطانیہ اور چین میں ظاہر ہوئی ہے۔

(۱) روس میں خروشیف کی معزولی بظاہر بہت عجیب سی نظر آتی ہے، لیکن وہ منطقی نتیجہ تھا اس ذہنیت کا جو اس نے وہاں پیدا کرنا چاہی تھی ـــــ اسٹالن جتنا گہرا شخص تھا اُتنا ہی اوتھلا خروشیف ہے ــ اسٹالن کبھی اپنے دل کی بات زبان پر نہیں لایا اور خروشیف نے اکثر وہی باتیں کہیں جن پر اسے خود بھی اعتماد نہ تھا۔ اسٹالن گویا ابوالہول تھا جو صرف دیکھتا تھا اور کہتا کچھ نہ تھا، برخلاف اس کے خروشیف ایک غراب تھا جو چیختا بھی تھا اور خطرہ کے وقت اپنی راہ بھی بدل دیتا تھا۔ اسٹالن چاہے جو کچھ رہا ہو لیکن وہ Bluffing سے متنفر تھا اور خروشیف نے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا صرف اسی Bluffing پر یہاں تک کہ آخرکار کیوبا میں جب اس کی یہ شیخی کرکری ہو گئی تو اس کے سامنے دو ہی راستے تھے، یا تو وہ امریکہ سے فوراً اس کا انتقام لیتا یا پھر یہ کہ وہ امریکہ ہی کی پالیسی اختیار کر کے پہلے اسے بھلاوے پر ڈالتا اور پھر اپنا مطلب پورا کرتا۔ چنانچہ اس نے دوسرا راستہ اختیار کرنا مناسب سمجھا اور جیسا کہ میں پہلے بھی ظاہر کر چکا ہوں، وہ بظاہر جمہوریت کی طرف مائل ہونے لگا یہاں تک کہ اس سلسلہ میں اس نے چین کی مخالفت سے بھی احتراز نہ کیا، اور اشتراکیت کو ایک نیا رنگ دینا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی بات نہ تھی جس پر اس کے تمام ساتھی یا اہلِ ملک متفق ہو سکتے۔ اس لئے اُنہوں نے خروشیف کی پالیسی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا اور جب انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا لینن کی قائم کی ہوئی پالیسی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے تو اُنہوں نے خروشیف کو نکال باہر کیا۔ خروشیف یوں بھی ذرا غیر سنجیدہ سا انسان تھا، وہ باتیں بہت کرتا تھا اور کبھی کبھی متانت سے گری ہوئی بھی، اس لئے روس کے سنجیدہ حلقوں میں اس کا احترام کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ بہرحال جو کچھ ہوا وہ خلافِ توقع نہ تھا، اب غور طلب امر یہ ہے کہ اس انقلاب کا اثر عالمی سیاسیات پر کیا ہوگا۔ ہرچند کہا یہی جاتا ہے کہ روس کی موجودہ پالیسی بدستور وہی رہیگی جو پہلے تھی، لیکن اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

سب سے پہلی تبدیلی جس کا ایشیا کی سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑے گا، یہ ہوگی کہ روس و چین کی کشیدگی ختم ہو جائے گی اور لازماً امریکہ سے بھی اس کے تعلقات کی نوعیت بدل کر رہے گی، کیونکہ امریکہ چین کے بارے میں کبھی کسی رواداری کو گوارا نہیں کر سکتا، اور اس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ ایشیا میں اپنا اقتدار قائم کرے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک چین کی سترکرور آبادی اور اس کے بڑھتے ہوئے عزائم کو پامال نہ کر دیا جائے۔

امریکہ کا بھارت کو ہر قسم کی بے تحاشہ اسلحہ و سامانِ جنگ فراہم کرنے کا سبب بھی یہی ہے کہ بھارت چین کے پہلو کا خنجر بنا رہے، اور اگر کبھی ضرورت ہو تو بھارت سے Stepping stone کا کام لیکر خود بھی سامنے آ جائے۔ ہرچند امریکہ کی یہ تمنا مشکل ہی سے

پوری ہوگی، کیونکہ اول تو چین کبھی بھارت پر حملہ کرنے کی حماقت میں مبتلا نہ ہوگا علاوہ بریں اگر وہ اسے فتح بھی کرلے تو ۴۰ کروڑ بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لئے وہ اپنے ملک والوں کو بھی فقر و فاقہ میں مبتلا کردے گا۔ دوسرے یہ کہ بھارت کے علاوہ قرب و جوار کے اور دوسرے علاقے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جن پر سیاسی نہیں تو لسانی، مذہبی اور جذباتی نقطۂ نظر سے قبضہ کرنے کا اسے زیادہ حق حاصل ہے۔

بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ خروشیف کی معزولی، امریکی پالیسی پر ایک ایسی ضرب ہے جس کے درد کو امریکہ آج نہیں تو کل ضرور محسوس کریگا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا اثر بین الاقوامی سیاست پر بھی پڑے اور ایشیا کے اندرونی حالات پر بھی۔

برطانیہ میں تیرہ سال کے بعد لیبر پارٹی کا پھر برسر اقتدار آجانا کوئی ایسی اہم بات نہیں کہ وہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو یا برطانیہ کی مستعمراتی پالیسی میں کوئی تبدیلی پیدا کرسکے۔ اسے بہرحال امریکہ کے دامن سے لگے رہنا اور ضروری ہے۔ خواہ وہاں کی حکومت مزدوروں کے ہاتھ سے نکل کر اشتراکی جماعت ہی کے ہاتھ میں کیوں نہ آجائے۔ برطانیہ ساری دنیا سے نرالا ملک ہے، نظام حکومت کا جو اسلوب وہاں قائم ہوچکا ہے اس میں نہ وزیروں کے تغیر و تبدل سے کوئی فرق آسکتا ہے، نہ پارٹیوں کے رد و بدل سے۔

چین کے ایٹم بم کے دھماکے سے امریکہ کا دل ہل جانا عجیب ... بات ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ چین کا اس حد تک ترقی کرجانا اس کے نزدیک مستبعد تھا، اور اب جو دفعتاً امریکہ کی نگاہ سے یہ پردہ ہٹا تو وہ حیران ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اگر چین نے جوہری توانائی سے کام لینے کی اہلیت ثابت کردی ہے تو وہ دفعتاً امریکہ یا روس کی جہاں سوز توانائی کی حد تک نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن جب ایک بار اس نے اس گُر کو سمجھ لیا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں اس کے اقدامات سریع و شدید ثابت نہ ہونگے۔ چینی قوم اپنے عزم و ارادہ کے لحاظ سے ایک بے پناہ قوم ہے۔ اور اس بھڑوں کے چھتے کو ایک بار چھیڑ دینا بڑا خطرہ مول لینا ہے۔

چین کا مطالبہ عرصہ سے یہی تھا کہ آتشی اسلحہ کا تجربہ بند ہوجانا چاہیئے۔ لیکن اسکا سبب یہ بتایا جاتا تھا کہ وہ خود اس توانائی سے کام لینے پر قادر نہیں ہے اسی لئے وہ اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس کا جواب چین نے عملی طور پر دیا اور وہ یہ کہ اس نے بم بنایا بھی اور اس کے دھماکے کی آواز بھی دنیا کے ہر گوشہ تک پہونچا دی۔ ہرچند اس کا نتیجہ یہ تو نہ ہوگا کہ مغرب میں آتشی اسلحہ بننے بند ہوجائیں، لیکن یہ ضرور ہوگا کہ چین کو مجلس اقوام میں شامل کرنے کی مخالفت کم ہوجائے گی، اور اگر روس و چین کا اختلاف دور ہوگیا جس کا اب قوی امکان ہے تو پھر ہوا کا رُخ یقیناً بدل جائے گا اور ایشیا پر اقتدار حاصل کرنے کا جو خواب امریکہ دیکھ رہا ہے وہ مشکل ہی سے پورا ہوسکے گا۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ

علی شیر خاں - محلہ کٹرانہ کلاں

رائے بریلی (یو۔پی)

مولوی البرامکہ!

کوثر چاندپوری

ایسے خوش نصیب مصنفین کم ہونگے، جو اپنی کسی تصنیف کے نام سے موسوم ہوئے ہوں، ایسی علمی اور تاریخی کتابوں کی تعداد بھی زیادہ نہ ہوگی جن کو "البرامکہ" کی ایسی شہرت نصیب ہوئی ہو، خاص طور پر ارباب علم میں، مولوی عبدالرزاق کانپوری بہت خوش قسمت مصنف تھے کہ انھیں مولوی البرامکہ" کے نام سے پکارا گیا، وجہ تسمیہ صرف ان کی کتاب، اور اس کی ہمہ گیر شہرت و مقبولیت ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال مولانا کو اسی نام سے یاد کرتی تھیں۔

مولانا عبدالرزاق کا شمار ان اکابر قوم میں کیا جا سکتا ہے جو علیگڑھ تحریک سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں عملی طور پر حصہ بھی لیتے تھے، وہ سرسید تحریک سے وابستہ یا مرعوب نہیں تھے بلکہ وقت اور سماج کے تقاضوں کے پیش نظر اسے پسند کرتے تھے، یوں مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں اُنہوں نے سرسید سے اختلاف بھی کیا ہے، کانفرنسوں میں ان کے مقابلہ پر بھی آئے ——ایک ایسا واقعہ بھی ملتا ہے جب ان کے مقابلہ میں سرسید کو شکست ہوئی ہے اور جمہور نے مولانا عبدالرزاق کی تجویز کو کثرت رائے سے منظور کیا ہے، اُنہوں نے مذہبی نقطۂ نظر سے درس نظامیہ کی تکمیل کو مسلمانوں کے لئے پسند کیا ہے اور اس سلسلہ میں عملی مساعی سے بھی دریغ نہیں کیا، "ندوۃ العلماء" کے بانیوں نے بھی اس کمیٹی کی تجاویز سے روشنی حاصل کی ہے جس میں مولانا اور ہندوستان کے دوسرے صف اوّل کے مذہبی دماغ شریک تھے: اس موقع پر مولانا عبدالرزاق اپنے اساتذہ کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، وہ سرسید، حالی، شبلی، منشی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور دوسرے مشاہیر ادب کی مجالس میں شریک رہے ہیں، ان سے تبادلۂ خیال کیا ہے اور اکثر ارباب علم نے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے، ان کا تصنیفی مرتبہ کسی طرح حالی اور شبلی سے پست نہیں ہے، اپنی تاریخی معلومات، وسعت نظر، اور اسلامی علوم پر فاضلانہ قدرت کے اعتبار سے وہ شبلی کے قدم بقدم ہیں، تحقیق و تلاش کا ایسا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں جس کی مثالیں اس دور میں کم ہی ملیں گی، طرز تحریر کی شگفتگی، سلاست اور طریق استدلال میں بھی انھیں امتیاز حاصل ہے، یہ خصوصیات صفحات کتاب اور قلم تک ہی محدود نہیں، ان کی زبان بھی ان میں برابر کی شریک ہے، تقریریں اور دوستانہ نیز معاصرانہ گفتگو میں ان کی حاضر دماغی اور برجستہ گوئی ہر موقعہ پر نمایاں نظر آتی ہے، زندہ دلی اور ظرافت، کی مثالیں ان کی زندگی میں نایاب نہیں، عہد شباب میں وہ زہد و اتقا کی زنجیروں کو جھٹکتے نظر آتے ہیں، اور زمانۂ انحطاط میں بھی واعظانہ خشکی کا شکار نہیں ہوتے، بڑھاپا اُن کے قلم کی روانی کو نہیں روک سکا، ہاتھ کانپنے کے باوجود ان کا قلم رواں دواں رہا، مولانا اپنے زمانہ کے تمام ارباب تصنیف اور رہنمایان قوم سے گہرا رابطہ رکھتے تھے، اور تعلیمی سرگرمیوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے یہ صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب تک وہ بھوپال نہیں آئے، یہاں آنے کے بعد ان کے مشاغل فرائض ملازمت کی ادائگی کے بعد صرف تصنیف و تالیف تک ہی محدود ہو گئے تھے، کانفرنسوں میں شرکت کرنا چھوڑ دی تھی، مولانا کا نام ایک مشہور اور وسیع النظر مصنف کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں محفوظ رہیگا۔ اور آنے والی نسلیں ان کی

مایۂ ناز تصانیف سے روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

مولانا کے اجداد کا وطن فرخ آباد تھا' ان کے والد پروفیسر الٰہی بخش نجوم اور رمل میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، اور ۱۸۵۷ء کے زلزلہ خیز ہنگامہ کے بعد کان پور آگئے تھے، اسی سرزمین کو جو مولانا عبدالرزاق ہی کی زبان میں "کمپو" کی حیثیت رکھتی تھی اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا:

مولوی عبدالرزاق ۱۷ رمضان ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو (اکتوبر) جمعہ کے دن انبالہ میں پیدا ہوئے' اس وقت ان کے اکثر اعزہ لاہور، سیالکوٹ اور انبالہ میں سکونت پذیر تھے۔

نقوش شخصیت نمبر میں مولانا کی تاریخ ولادت ۱۸۷۴ء بتائی گئی ہے' لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا' مولانا نے اپنی کتاب یاد ایام کے خاتمہ میں جو ۲ رمئی ۱۹۴۵ء مطابق ۱۹ رجمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ کو قیام بھوپال کے زمانہ میں قلمبند کیا گیا ہے' اپنی عمر اٹھتر سال بیان کی ہے۔ اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۸۶۷ء قرار پاتا ہے۔ یہ اس لئے بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۶ء سے ان کی علمی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں یہ ممکن نہیں کہ بارہ سال کا لڑکا ان سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔ اگر مولانا کی ولادت خود ان کے بیان کی روشنی میں ۱۸۶۷ء تسلیم کر لی جائے تو ۱۸۸۶ء میں ان کی عمر انیس سال ہوتی ہے اور یہ سن ایسا نہیں جس میں ایک ذہین اور ہونہار نوجوان علمی تحریکات میں اپنا حصہ ادا نہ کر سکے؛ بہر حال پانچ برس کی عمر کو پہونچکر فتحپور ہسوہ میں ان کی مکتب نشینی اور بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔ پورے سترہ سال تک وہ تعلیم حاصل کرتے رہے' اُنھوں نے خود اپنے بیان کے مطابق منشی میر امام علی سے جو فرنگی محل کے تعلیم یافتہ تھے' دس سال میں فارسی کی تکمیل کی پھر عربی شروع کی' قطبی ختم کرکے مدرسہ فیض عام میں داخل ہوئے جہاں مولانا احمد حسن مدرس اول سے اُنھوں نے حدیث کا درس لیا' مولانا احمد حسن پنجابی تھے اور "یعقوبی" کہلاتے تھے' اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں قطبی تک عربی کی تعلیم حاصل کرکے وہ کان پور کے مدرسۂ فیض عام میں پڑھنے لگے تھے' فتحپور کے دوران تعلیم میں اُنھوں نے حکیم مولوی ظہور الاسلام بانی مدرسہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے اسی بنا پر وہ انھیں اپنا اُستاد لکھتے ہیں' ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے مولانا نے مڈل پاس کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی' اور کئی جگہ مدرسی اور سر رشتہ داری کے فرائض انجام دیئے' جس زمانہ میں ڈپٹی نذیر احمد کان پور میں تحصیلدار ہو کر آئے ہیں وہ محافظ خانہ کلکٹری کان پور میں اہلمد تلعف تھے' قیام ندوہ کے بعد اس کے آنریری محاسب کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے تھے' اس سلسلہ میں ہر اتوار کو انھیں لکھنؤ آنا پڑتا تھا۔

منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کان پور سے ان کے گہرے اور دوستانہ تعلقات تھے' انہیں کے ساتھ مولانا ۱۸۸۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے علیگڈھ گئے تھے' یہ ان کا علمی میدان میں پہلا قدم تھا؛ اس کے بعد وہ منشی رحمت اللہ کی معیت میں ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کرتے رہے' قومی و تعلیمی اجتماعات میں بھی دونوں ساتھ جاتے تھے' رعد نے ۱۸۸۲ء میں نامی پریس قائم کیا تھا جس میں مولانا نے پینتیس ۳۵ سال تک کام کیا' اُنھوں نے تیس سال لگاتار رعد کی بڑی جنتری میں شاہان اسلام کی تاریخ پر مضامین لکھے؛ انہیں تعلقات کا نتیجہ تھا کہ اُنہوں نے ۱۹۳۱ء میں رعد کی سوانح عمری لکھی' ان کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوانح عمری چھپ چکی ہے' لیکن ان کی تصانیف کے ذیل میں کہیں اس کا نام نہیں آتا' اور بعض کتابیں بھی اسی بے توجہی کے باعث مولانا کی فہرست تصانیف میں شامل نہیں ہو سکیں؛ غالباً رعد ہی مشاہیر سے ان کے تعارف اور روشناسی کا ذریعہ بنے' سر سید اور دوسرے ارباب علم سے رعد کے دوستانہ مراسم تھے' علیگڈھ کالج کو اُنھوں نے بڑی بڑی رقمیں نذر کی تھیں۔

بڑے لوگوں سے ملنے کا مولانا کو ابتدا ہی سے شوق تھا' چنانچہ ۱۸۹۴ء میں مولانا عبدالحلیم شرر انجمن اخوان الصفا کان پور کے جلسہ میں شرکت کرنے آئے تو اُنہوں نے شرر سے ملاقات کی' اس کے بعد بھی وہ لکھنؤ میں ان سے ملتے رہے۔ اسی طرح فتحپور کے تحصیلی

اسکول کی تعلیم کے دوران میں اُنھوں نے مشہور مؤرخ مولوی ذکاء اللہ سے کان پور ہی میں ملاقات کا موقعہ حاصل کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب صوبۂ الہ آباد کے تمام ابتدائی مدارس میں منشی ذکاء اللہ کی ریڈریں داخل نصاب تھیں اس وقت تک اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں عوام سے روشناس نہ ہوئی تھیں، اُن کا دور بہت بعد میں آیا۔ اس کے بعد مولانا الہ آباد جاکر منشی ذکاء اللہ سے ملے اس وقت وہ شرح جامی پڑھ رہے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ذکاء اللہ صاحب سے مولانا کی ایک اور ملاقات علیگڑھ میں ہوئی۔ کان پور ہی میں اُنھوں نے محمد حسین آزاد کا لیکچر سُنا مولانا پر آزاد کی زبان کا جادو چل گیا، وہ ان سے لاہور ملنے بھی گئے اس وقت آزاد کا دماغ مختل ہو چکا تھا، مولانا نے صبح کی ہوا خوری کو جاتے وقت ان سے راوی کے راستے میں باتیں کیں، آزاد نے پوچھا کیا چاہتے ہو، مولانا نے کہا دعا۔ چنانچہ آزاد نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی۔ حالانکہ ذرا دیر پہلے وہ ایک نوجوان کو ڈانٹ کر بھگا چکے تھے۔ مولانا نے ایڈیٹر رفیق ہند لاہور سے آزاد کے لیکچر کی نقل حاصل کی اور اسے کان پور کے اخبار عالم تصویر میں شائع کرادیا جو ہندوستان کا اولین مصور اخبار تھا اور رعد ہی نے جاری کیا تھا۔ مولانا کی رائے میں آزاد اردو کے بہترین انشا پرداز تھے، ان کا خیال ہے کہ شعر العجم میں جہاں آزاد کی انشا پردازی کا رنگ ہے وہ محض تقلید ہی ہے، شبلی نے ان کی "سخندانِ فارس" کو بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ یہ کتاب سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

۱۸۹۸ء میں مولانا کو اکبر الہ آبادی سے چند بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ اکبر شروع میں سرسید کے مخالفین اور سجاد حسین کے ہم نواؤں میں تھے، اگرچہ بعد میں اُنھوں نے سرسید کا اعتراف کر لیا تھا، تاہم مولانا کے خیال میں صوبۂ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کو ان کی شاعری سے نقصان پہونچا حالانکہ خود اپنے لئے اکبر کا فیصلہ دوسرا تھا، وہ مسلم عوام کو مغربی تعلیم سے روکتے تھے مگر اپنے صاحبزادے عشرت حسین کو اُنھوں نے انگریزی تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجا، مولانا نے اکبر کے قول و عمل کے حیرت انگیز تضاد کو محسوس کیا ہے۔ اکبر جج ہو کر کان پور آئے تو شعر و سخن کی محفلیں جمنے لگیں، مولانا بھی شرکت کرتے رہے اس طرح اکبر سے ان کا رشتۂ ارتباط کافی مضبوط ہو گیا۔

۱۸۹۱ء میں کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں علی گڑھ کے مقام پر مولانا نے اپنے اُستاد حکیم مولوی ظہور الحسن فتحپوری کے ارشاد پر مذہبی اصلاح اور قدیم مشرقی تعلیم کے سلسلہ میں ایک کمیٹی کی تشکیل پر ایک رزولیوشن پیش کیا جو سرسید کی مخالفت کے باعث منظور نہ ہو سکا اور خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد کان پور میں ظہور الاسلام صاحب کے ایماء ہی سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں مولانا اشرف علی صاحب اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو ممبر منتخب کیا گیا۔ مولانا عبد الرزاق اس کے آنریری ممبر اور روئداد نگار تھے۔ اس کمیٹی کی آواز کافی وزن دار ثابت ہوئی۔ چنانچہ اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس کے موقعہ پر جو کان پور ہی میں ہوا تھا اس کی تجاویز سے کافی فائدہ اُٹھایا گیا۔

۱۸۹۹ء میں مولانا ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعہ پر کلکتہ گئے، وہاں جسٹس امیر علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور رضا علی وحشت سے ملاقاتیں ہوئیں، مٹیا برج دیکھنے کا موقعہ بھی ملا، واپسی میں عظیم آباد پٹنہ کی مشہور عالم اورینٹل لائبریری دیکھی جو بالکل ان کے مذاق کی چیز تھی، خان بہادر خدا بخش نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ شاد عظیم آبادی جیسے مشہور فن کار سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۰۶ء میں مولانا نے ندوۃ العلماء کے گیارھویں اجلاس میں شرکت کی جو بنارس میں منعقد ہوا تھا، یہ ان کی آخری شرکت تھی اس کے بعد انھیں کبھی کسی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقعہ نہیں ملا، کیونکہ وہ تحصیلدار ہو کر بھوپال چلے آئے، اور پھر اس قسم کی مصروفیتوں میں حصہ نہیں لے سکے۔ اسی اجلاس کے اختتام پر مولانا نے پہلی مرتبہ اپنی تقریری صلاحیت کا مظاہرہ کیا، اس سے قبل وہ منتخب طلباء میں تقریریں کر چکے تھے جن کو مولانا شبلی نے ادب، علوم قرآن، اور تفسیر کا درس دیا تھا۔ مولانا نے اپنی تقریر میں طلباء کی تقریروں کا تجزیہ کر کے ان کے اور دوسرے مدارس کے طلباء کے مابین خط امتیاز قائم کیا، یہ انداز خطابت پسند کیا گیا، آخر میں مولانا شبلی نے

کہا کہ میں آپ کو ادیب ہی سمجھتا تھا آپ مقرر بھی ہیں۔ مولانا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ع

ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا ؟

یہ صرف تعلّی نہیں تھی زیادہ سے زیادہ ایک ادبی انا تھی ـــــــ جو کسی فن کار کی ادبی صلاحیتوں کے دوش بدوش غیر محسوس طور پر اُبھرتی ہے اسے کسی طرح غرور یا تعلّی نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا کی مختلف تصانیف سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ علم، ادب اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر کس روانی اور بے تکلفی سے بولتے اور لکھتے تھے، زبان کی تاریخ یا شعر اور عروض کی بحث، ریختی کا ذکر ہو یا موسیقی، رقص اور تھیٹر کا وہ نہایت شگفتگی اور برجستگی کے ساتھ اظہار خیال کرنے کی پوری قدرت رکھتے تھے،

علیگڑھ کے ابتدائی جلسوں میں بھی مولانا تقاریر کرتے رہے تھے، ایک جلسہ میں اُنہوں نے اپنا رزولیوشن پیش کرتے ہوئے بڑی فاضلانہ تقریر کی تھی، رزولیوشن کا مقصد یہ تھا کہ گورنمنٹ ہر کالج اور ہائی اسکول میں مسلم بچوں کی مذہبی تعلیم کے لئے ایک معلم کا بندوبست کرے اور نصاب مقررہ کے علاوہ نصف گھنٹہ دینیات کی تعلیم کے لئے وقف کیا جائے۔

سرسید نے اس رزولیوشن کی مخالفت میں نہایت پُرجوش الفاظ میں اظہار خیال کیا، ان کا نقطہ نظر رزولیوشن کی اصل روح کے منافی تھا مگر سید کامیاب نہ ہو سکے اور رزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا، اگرچہ آگے چل کر نتیجہ وہی ہوا جو سرسید چاہتے تھے اور گورنمنٹ نے عملی دشواریوں کے پیش نظر اسے نامنظور کر دیا۔ بہر حال اسٹریچی ہال سے ڈپٹی نذیر احمد نے مولانا کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ "ویری گڈ" (very good.) اور نواب محسن الملک نے داد دیتے ہوئے فرمایا۔ "صاحبزادے، اگر میں جلسہ میں موجود نہ ہوتا اور تمہاری حمایت نہ کرتا تو سرسید کی کبڑی (لکڑی) تمہاری خبر لیتی میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تم کو بچا لیا۔

میں نے یوم حسین پر بھوپال میں مولانا کی تقریر سُنی تھی، میں بھی انہیں ایک مورخ اور صاحب قلم کی حیثیت سے جانتا تھا، جاڑوں کا زمانہ تھا یونانی شفا خانہ والے میدان میں شامیانہ کے نیچے اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر متعدد مقررین بیٹھے تھے، مولانا کے بولنے کا وقت آیا تو وہ ایک ادنیٰ شال میں لپٹے اور جُھکے جُھکے مائک پر آئے اور نہایت اچھے خطیبانہ انداز میں بولنا شروع کر دیا، نصف گھنٹہ تک وہ نہایت روانی کے ساتھ بڑے متوازن لب و لہجہ میں تقریر فرماتے رہے، اور بعض مقرروں کے چہروں سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میدان اپنے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر گھبرا رہے ہیں، انہیں فکر ہوئی اور مولانا کو کسی نہ کسی طرح بٹھا دیا گیا۔ میں نے ایک دوست سے کہا:۔

"مارا بہ ایں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود" حالانکہ جسے میں غلطی سے "گیاہ ضعیف" سمجھتا تھا وہ بڑا مرد آہن تھا اور نہ جانے کتنے معرکے سر کر چکا تھا؛

مولانا نہایت زندہ دل اور بذلہ سنج تھے، وہ شاعر نہ تھے لیکن شعر و ادب سے نہ صرف دلچسپی بلکہ اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، زمانۂ تعلیم ہی سے جب ان کی عمر بارہ برس کی تھی اور گلستاں پڑھا کرتے تھے، انہیں بیت بازی کے مشغلہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ اسی ضرورت سے اشعار یاد کیا کرتے تھے، شعر کے ساتھ ہی انہیں دوسرے فنون لطیفہ سے بھی لگاؤ تھا، اس کی بنیاد ذوق جمال کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اور بقول ان کے علمی تحقیقات کے فطری رجحان کو بھی، اور عالم شباب کے ان سرکش جذبات کو بھی جو اپنی تیز گامی کی دھن میں کسی روک ٹوک کی بہت کم پرواہ کیا کرتے ہیں، اور ایک نوجوان یہ کہہ کر بے بسی کا اعتراف کر لیتا ہے ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں !

چنانچہ مولانا نے بھی مشاغل رقص و سرود کا ذکر کرتے ہوئے لکھدیا ہے:۔

"عالم شباب زہد و تقویٰ کی حکومت سے آزاد ہوتا ہے" (یاد ایام صفحہ ۱۰۵)

مولانا کے ان رنگین مشاغل کا آغاز جن پر علمی تحقیقات "کا ریشمی پردہ پڑا ہوا ہے اس وقت سے ہوا جب ان کی عمر پندرہ سال کی تھی انہوں نے کان پور میں جنم اشٹمی کے موقعہ پر مشہور رقاص بندادین کا ناچ دیکھا اور اس کی نرت سے بہت متاثر ہوئے، دلفریب اداؤں کا اثر بھی قبول کیا۔ مسوری میں انہوں نے شکسپیر کے ایک ڈرامہ دیکھنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے رہس کی سبھاؤں میں بھی شرکت کی ہے پھر جس انداز سے انہوں نے تھیٹر اور سینما کا ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسٹیج اور پردۂ سیمیں پر تھرکتی ہوئی جان دار اور بے جان تصاویر کا نظارہ بھی کرچکے ہیں، اس مصروفیت کو علمی تحقیقات سے الگ کرکے بھی دیکھا جائے تو استعجاب کا موقعہ نہیں وہ مولانا شبلی کے بے تکلف اور عزیز دوست تھے، جن کی رنگین مزاجی خود مولانا کی شہادت سے مسلّم ہے۔ عالم شباب یا عہد ظلمت میں مولانا نے مسلمان کشمیریوں کے رقص دیکھے ہیں، حیدر چونہ والی کا گانا سنا ہے، اور کلکتہ میں بجلی نمائش میں گوہر (منصرم والی) کی موسیقی سے بھی لطف اٹھایا ہے۔ زہرہ اور مشتری لکھنؤ کی مشہور طوائفیں تھیں، زہرہ کو مولانا نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ بڑھاپے کی منزل میں تھے، فتحپور میں مشتری نے اپنے کمال رقص کا مظاہرہ کیا تو مولانا بھی صف نظارگان میں موجود تھے۔ مشتری اپنی تصنیف کی ہوئی غزلیں گایا کرتی تھی، مولانا نے یادِ ایام میں اس کے یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

جھوٹی پھر کس کی قسم کھایئے گا   سر مرا کاٹ کے پچھتایئے گا
آپ سُنئے گا تو شرمایئے گا   رات کا خواب الٰہی توبہ

جدن کا رقص طاؤسی (مورپنکھی) انہوں نے بھوپال میں جشن سالگرہ کے سلسلہ میں دیکھا، منشی احمد علی شوق بھی اس وقت ان کے قریب بیٹھے تھے۔

مولانا شبلی سے مراسم کا ذکر ابھی کیا جاچکا ہے۔ مولانا شبلی لکھنؤ میں مقیم تھے اور مولانا عبدالرزاق ندوۃ العلماء کے آنریری محاسب ہونے کی حیثیت سے ہر اتوار کو کان پور سے لکھنؤ آیا کرتے تھے، مولانا شبلی کا پاؤں بندوق لگ جانے کی وجہ سے کاٹا جاچکا تھا وہ تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے، چاہتے تھے کہ کسی ایسی حسین، نوجوان اور تعلیم یافتہ خاتون سے عقد کریں جو شعر و موسیقی کا ذوق رکھتی ہو، ایک شرط نکاح سے پہلے ایک نظر دیکھ لینے کی بھی تھی، لکھنؤ میں ان اوصاف کی ایک خاتون مل گئی تھیں، لیکن مولانا کے مشورہ سے مولانا شبلی نے اپنا ارادہ تبدیل کردیا۔

مولانا تصنیف و تالیف کا فطری ذوق رکھتے تھے، ان کی پہلی اور معرکۃ الآرا تصنیف "البرامکہ" ہے جس کو انہوں نے نہایت محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے، موضوع دلچسپ بھی ہے اور عبرت خیز بھی، مواد کی تلاش اور ترتیب میں مولانا نے بڑی فن کاری اور دانشوری کا ثبوت دیا ہے۔ اسی کتاب کی تالیف کے دوران میں وہ ۱۸۹۰ء میں سرسید کے مہمان ہوئے تھے اور ان کے ذاتی کتب خانہ سے یورپ کی بعض مطبوعات کا انتخاب کیا تھا۔ البرامکہ پہلی مرتبہ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں نامی پریس کان پور سے شائع ہوئی۔ یہ سلسلہ وزرائے اسلام کی پہلی کڑی تھی، اس کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا کا تعارف علمی حلقوں میں ایک مصنف کی حیثیت سے البرامکہ ہی نے کرایا، ارباب علم اس کے مطالعہ سے بیحد محظوظ ہوئے اور سب نے اس کارنامہ کو سراہا، سرسید اس زمانہ میں بستر مرگ پر تھے۔ مولانا نے ایک جلد انھیں بھیجی، مولانا وحیدالدین سلیم نے سرسید کو پیش کی، انہوں نے چند صفحات پڑھ کر کہا "احتیاط سے رکھی جائے میں اس پر تبصرہ کروں گا" کتاب مولانا شبلی سے منسوب کی گئی تھی۔ سرسید نے تہدیہ کی عبارت دیکھ کر کہا کہ مصنف نے بڑی غلطی کی ہے اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی سے کیوں کیا گیا، یہ تو میرا حق تھا، سرسید کا تعلق دہلی کے خاندان وزارت سے تھا اور کتاب ان وزراء کے حالات سے بحث کرتی ہے جن کا تعلق "آل برمک" سے تھا، اسی بنا پر سرسید نے اس پر اپنا حق جتایا تھا۔ البرامکہ کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا ایک مرتبہ امروہہ گئے۔ نواب وقار الملک وہیں مقیم تھے اور اس زمانہ میں

بیمار تھے، لیکن مولانا کا بیحد احترام کرتے تھے، اطلاع پاتے ہی استقبال کو آئے اور جھک کر مولانا کے بوٹ کو آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ میرا خیال تھا کہ آپ کان پور کے واقعہ میں کام آچکے ہیں، اس وقت آپ کو زندہ دیکھ کر میں نے شکریہ ادا کیا۔" یہ احترام محض ایک مورخ اور مصنف کے لئے تھا۔

البرامکہ کا دوسرا ایڈیشن مولوی غلام محمد مالک اخبار وکیل امرتسر نے ۱۹۰۶ء میں مصنف کی اجازت سے شائع کیا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن بعض تاجران کتب نے اجازت کے بغیر ہی چھاپ لیا۔ پانچویں بار یہ کتاب اضافوں اور نظر ثانی کے بعد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اضافات کا اثر اس کی ضخامت پر پڑا۔ چنانچہ اس ایڈیشن کی ضخامت ۷۰۲ صفحات ہو گئی۔ اس کا دیباچہ ۱۲ر مئی ۱۹۳۸ء کو اور خاتمہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو لکھا گیا ہے، لیکن پریس سے بہت بعد کو آئی ہے۔

۱۹۰۶ء میں مولانا تحصیلدار ہو کر بھوپال آگئے۔ یہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کا عہد حکومت تھا جو خود بھی تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ بھوپال آنے کے مختلف سنین ملتے ہیں، نقوش مکاتیب نمبر میں ۱۹۱۰ء میں بھوپال آنا ظاہر کیا گیا ہے۔ مولانا خود ۱۹۰۶ء لکھتے ہیں، لیکن ان کے اپنے بیان میں بھی ہلکا سا تضاد ہے، پھر بھی یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ مارچ ۱۹۰۶ء کے بعد کسی مہینے میں بھوپال آئے، کیونکہ ۱۹۰۶ء کے بعد وہ کسی کانفرنس وغیرہ میں شرکت نہیں کر سکے۔ جس زمانہ میں مولانا تحصیلدار ہوئے ہیں مولوی نصیر الدین صاحب معین المہام تھے، چند سال تک مولانا انہیں کے ماتحت رہے۔ ان کا تعلق علی امام اور حسن امام کے خاندان سے وابستہ تھا۔ حسن امام سے مولانا ۱۹۰۵ء میں ڈھاکہ کے مقام پر ملے تھے، بھوپال آنے کے بعد مولانا کا تصنیفی مشغلہ جاری رہا اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ بھوپال خود ایک علمی مرکز تھا، لیکن مولانا دار السلطنت سے تقریباً ۶۰ میل دور تحصیل بیگم گنج (سیورانس) میں تعینات تھے، سفر کے ذرائع آسان نہیں تھے، بیگم گنج تک پختہ سڑک بھی نہ تھی، ریل اور موٹر کا تو ذکر ہی کیا، پھر زمانہ ایسا تھا کہ تحصیلدار ایسا عہدیدار جو اپنی تحصیل میں خود مختار حاکم پرگنہ کی پوزیشن رکھتا تھا پرگنہ کا مجسٹریٹ بھی ہوتا تھا۔ شکار، تاش، شطرنج اور نغمہ و سرود کی محفلوں ہی سے دل بہلایا کرتا تھا، لیکن مولانا نے ان چیزوں میں وقت ضائع نہیں کیا وہ اتنے دور دراز مقام پر بھی اپنے پاکیزہ ذوق کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ بیگم گنج ہی میں انہوں نے سلسلۂ وزرائے اسلام کی دوسری جلد نظام الملک طوسی کے نام سے مکمل کی جو ان کے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ کان پور ہی سے شائع ہوئی۔ ۱۹۱۰ء تک اس کے چار سو صفحات چھپ چکے تھے اور مسودہ ختم ہو گیا تھا اسی درمیان وہ بیگم گنج پہونچ گئے اور وہاں انہیں بالکل دوسری قسم کی مصروفیتوں سے واسطہ پڑا یعنی مالی، فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کی سماعت، اور مال گذاری وصول کرنے کے اہم مراحل سے گذرنا پڑا، تاہم ان کا اصل رجحان برقرار رہا اور انھوں نے اپنے آرام کا وقت اس کتاب کی نذر کر دیا، وہ راتوں کو جاگ کر نظام الملک کی تکمیل میں مصروف رہے۔ اور بیگم گنج میں ہی یہ کام سرانجام کو پہونچ گیا، صرف یہی نہیں بلکہ تاریخ آل سلجوق، حیات رشید اعظم، اور ایک قدیم سفرنامہ کو ایڈٹ کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نظام الملک کا خاتمہ ۳ر جنوری ۱۹۱۱ء مطابق ۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ قلعۂ بیگم گنج ہی میں تحریر کیا۔ دیباچہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۱ء مطابق ۲۳ر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ کو کان پور میں لکھا گیا جو ۱۶ صفحات کو محیط ہے۔

۱۹۱۶ء کو مولانا منتظم تاریخ بنا دیئے گئے اور آخر تک اسی عہدے پر ممتاز رہے۔ میں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان مولانا سے ملتا رہا ہوں اس وقت جہاں تک مجھے یاد ہے وہ پنشن یاب ہو چکے تھے، پہلے ان کا قیام ظہور میاں تحصیلدار کی بالائی منزل پر تھا، میں اسی مکان میں ان سے ملا ہوں، اس کے بعد وہ بدھوارے کے باہر کسی جگہ رہنے لگے تھے۔ لڑکی اور داماد انہیں کی کفالت میں تھے۔ داماد اپنے آپ کو واقف ردولوی لکھتے تھے، شاعری کا ذوق تھا، عام انداز کی غزلیں کہا کرتے تھے بڑے لاابالی آدمی تھے۔ راستبازی سے نفرت سی تھی، مولانا ان سے خوش نہیں تھے، لیکن عالی ظرف انسان تھے زبان سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ مجھ سے چند ملاقاتوں ہی میں مانوس ہو گئے تھے۔

مولانا کی وجہ سے اکثر مشاہیر بھوپال آتے تھے مولانا وحید الدین سلیم حیدر آباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ان سے ملنے کی غرض سے بھوپال اترتے تھے قیام مولانا ہی کے یہاں رہتا تھا' مولانا شبلی سیرت النبی کی تصنیف کے دوران میں بھوپال آئے تھے اور تیسرے روز مولانا کے ساتھ ہی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ سے ملاقات کی تھی' مولانا شبلی نے امداد کے لئے درخواست پیش کی تھی' آخر میں یہ اشعار لکھے تھے:-

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی		مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم		خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکار عالیہ ان اشعار کو سن کر بیحد متاثر ہوئیں اور دو سو روپے ماہانہ سیرت النبی کے لئے مقرر کر دیے۔ اسی امداد کے سہارے سیرت کا کام شروع ہو گیا۔ اس کی ایک جلد مولانا شبلی کی لکھی ہوئی ہے۔ باقی جلدیں مولانا کی حسب ہدایت اور ان کی آخری آرزو کے بموجب مولانا سلیمان ندوی نے لکھی ہیں۔ اس طرح ۵ جلدوں میں سیرت النبی چھپ چکی ہے۔

عجیب بات ہے کہ سیرت کی طباعت میں بھوپال کی نہایت مؤثر مدد شامل تھی' لیکن مسلمانان بھوپال ہی نے اس کی شدید مخالفت کی، پہلی جلد کی اشاعت کے بعد دیوبند سے ایک رسالہ چھپا تھا جس میں شبلی کی مرتبہ سیرت پر اعتراضات کیے گئے تھے؛ یہ رسالہ بھوپال پہونچا تو اس زمانہ کے مفتی ریاست نے پڑھا اور مولانا عبد الرزاق کو بھی دیا' پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر فرمایا:-

"خداوندا اس کتاب کو شبلی کے ہاتھ سے بچانا وہ کبھی اس کی تکمیل پر قادر نہ ہو سکے!"

مولانا کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہا' انھوں نے منشی رحمت اللہ رعد کی خبری میں تاریخ ایران' تاریخ آل عثمان' اور تاریخ بھوپال پر برسوں مضامین لکھے' اور غیر مطبوعہ کتابوں کی بھی بڑی تعداد چھوڑی جن میں حسب ذیل تصانیف شامل ہیں:-

(۱) تاریخ مآثر جلالی (۲) تاریخ اسلام (۳) عہد جاہلیت عرب (۴) عہد رسالت (۵) خلافت راشدہ (۶) سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی (اس پر مولانا نے شرح حواشی لکھے ہیں) (۷) تاریخ آل سلجوق (۸) حیات رشید — معلوم نہیں ان کے مسودات اب محفوظ ہیں یا نہیں کاش یہ کسی طرح شائع ہو سکتے' اس کے علاوہ بھی مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے ان کے اس خط سے بعض اور تصانیف کا حال بھی معلوم ہوتا ہے' یہ خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں چھپ چکا ہے' اور مولوی محمد الدین فوق کو فلک منزل شاہجہاں آباد ریاست بھوپال سے لکھا گیا ہے۔

برادر محترم فوق السلام علیکم۔

یاد فرمائی کا دلی شکریہ' ۲؍ جنوری ۱۹۳۹ء کا خط سامنے ہے' لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے جواب نہ دے سکا' معاف فرمائیگا' خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں اور باوجود رعشہ کے قلم چل رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء لغایت ۱۹۲۷ء اس مدت میں حسب حکم سرکار عالیہ مرحوم فرمانروائے بھوپال میں نے تاریخ اسلام کے پانچ ہزار صفحے لکھے از عہد جاہلیت عرب تا خلافت فاروق اعظم۔ عہد جاہلیت کی دو جلدیں رئیسہ کے محل سے گم ہو گئیں جس کا انتہائی صدمہ ہے' اور دوبارہ لکھنا غیر ممکن ہے۔ اب ریاست اس کو طبع نہیں کرے گی۔ روپیہ کا انتظام ہو گیا تو خود شائع کروں گا' البرامکہ بعد نظر ثانی زیر طبع ہے۔ تقریباً تین سو صفحات کا اضافہ ہو کر سات سو صفحات پر کتاب ختم ہوئی ہے' اب کتاب مکمل ہو گئی ہے اور صدہا مضامین بڑھ گئے ہیں' ان شاء اللہ اس ششماہی میں شائع ہو گی' کان پور میں زیر طبع ہے۔ میں فی الحال اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال کی سوانحعمری لکھ رہا ہوں از ولادت تا صدارت ۲۶ سال کے واقعات لکھ چکا ہوں' اور ایک جلد بانئ ریاست بھوپال کی تاریخ مکمل ہو گئی ہے یہ سرکاری پریس میں طبع ہو گی' جب تک آپ زندہ ہیں ادبی خدمات انجام دیجئے اور آئندہ نسلوں کے لئے کارنامے چھوڑ جایئے۔ صحافت کا دور ختم ہو چکا ہے' اس کا چارج تعلیم یافتہ طبقہ کے سپرد فرمایئے' کبھی کبھی خیریت سے اطلاع دیا کیجئے۔		۲؍ مئی ۱۹۳۹ء

(مولوی) عبد الرزاق (کانپوری) مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی

اس سے قبل مولانا شبلی سے مولانا کے بے تکلف مراسم کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے عزم نکاح کا بھی تذکرہ آچکا ہے۔ اب مولانا کا ایک خط پڑھئے جس سے مولانا شبلی کی رنگین مزاجی اور حسن دوستی پر روشنی پڑتی ہے' یہ خط بھی نقوش "مکاتیب نمبر" ہی سے نقل کیا جا رہا ہے' جس میں مکتوب الیہ کا نام مولوی محمدالدین زبیری درج ہے مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے خط یقیناً محمد امین زبیری کو لکھا گیا ہے جو دفتر تاریخ ہی سے کسی زمانہ میں وابستہ رہ چکے تھے' اُنھوں نے مولانا شبلی کی رنگین مزاجی سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ خط میں القاب و خطاب وغیرہ نہیں ہے۔

"میرے اور مولانا شبلی کے تعلقات کانفرنس کے پہلے جلسہ منعقدہ ۱۸۸۶ء لکھنؤ سے شروع ہوئے جن کی تکمیل ندوۃ العلماء کے قیام پر ہوئی۔ مولانا محمد علی جو ناظم اول تھے وہ میرے اُستاد تھے اور انہیں کی وجہ سے مجھے ندوہ میں شرکت عملی کرنے کا موقعہ ملا' میں نے یادِ ایام میں اپنے ان تعلقات کو تفصیل سے لکھا ہے' لیکن اس بیان میں زمانہ شباب کی رنگین صحبتوں کو نظر انداز کر دیا ہے' کیونکہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کا بے انتہا اصرار تھا کہ ان واقعات کو نہ لکھا جائے وہ میرا مسودہ دیکھ چکے تھے اور چھاپنے کے لئے بھی لے گئے تھے۔ لیکن نہیں معلوم کیا سبب ہوا کہ مسودہ واپس کر دیا اور اس حصہ کے خارج کر دینے پر زور دیا' کوئی شک نہیں کہ مولانا شبلی رنگین مزاج تھے اور رنگین صحبتوں کے شایق' ممکن ہے کہ یہ مذاق شاعرانہ طبیعت کا باعث ہو۔

وہ حادثۂ گزند پا کے بعد بھی لکھنؤ میں ایک عقد کرنا چاہتے تھے' اور ایک مہذب اور شائستہ بیگم بھی انتخاب ہو چکی تھی' مجھ سے جب مشورہ ہوا تو میں نے کہا تیمور کا اقبال گر چکا ہے' لکھنؤ کی بیگم سے نکاح کر کے آفت میں پڑ جاؤ گے۔ تجویز عقد سے پہلے یہ بھی ایک شرط تھی کہ جس سے عقد ہو وہ سخن سنج' اور خوش مذاق اور شاعر بھی ہو اور حسن صورت اور حسن سیرت بھی ضروری ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ایسی عورت آپ کو پسند نہ کرے گی۔ چنانچہ دوسرے ہفتہ میں جب ملاقات ہوئی تو مولانا نے کہا کہ میں نے غور کر کے تمھاری رائے سے اتفاق کر لیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال عرصہ تک ان کے دل سے نہیں نکلا تھا۔"

۳۱ر جولائی ۱۹۴۵ء　　عبد الرزاق

مولانا سیاست کے مرد میدان نہیں تھے' اُنھوں نے ملک معظم جارج پنجم اور علیا حضرت ملکۂ معظمہ میری کی شان میں مختصر سا نثری قصیدہ بھی نظام الملک کے دیباچہ کے آخر میں لکھا ہے' اس معاملہ میں وہ خواجہ الطاف حسین حالی کے قدم بہ قدم معلوم ہوتے ہیں' انگریزی حکومت دونوں ہی کے نزدیک ملک کے لئے برکت اور رحمت تھی۔

۱۸۹۴ء میں مولانا شبلی کا سفرنامہ مصر و روم و شام شایع ہوا تو مولانا نے مولانا شبلی کے بھائی مہدی صاحب منصف کان پور کی ترغیب سے اس پر تبصرہ کیا جو اخبار آزاد کان پور میں چھپا' اس کے ایڈیٹر مولانا مغربی تھے۔ اس کے چھپتے ہی کان پور کے مجسٹریٹ کے اجلاس پر مولانا طلب کیے گئے۔ مولانا ڈر گئے' اور اپنی ناتجربہ کاری نیز سیاسیات سے ناواقفیت کا حیلہ کیا' مولانا کو ہلکی سی زبانی تنبیہ کے بعد معاف کر دیا گیا' برطانوی حکومت نے سفرنامہ کی اشاعت پر مولانا شبلی پر بھی اعتراض کیا تھا اور انہیں "تمغۂ مجیدی" کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ سرسید نے بھی مولانا شبلی کے اس جوش عقیدت کو ناپسند کیا تھا جس کا اظہار اُنھوں نے سلطان عبد الحمید کے ساتھ کیا تھا۔

۱۸ر فروری ۱۹۴۶ء کو اس مشہور مصنف اور اہل قلم نے ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے منھ موڑ لیا۔ انتقال کے وقت وہ شاہجہاں آباد میں رہنے لگے تھے' ان کے حواس بھی صحیح نہیں رہے تھے۔

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا عبد الرزاق کا مرتبہ تصنیف بہت بلند اور مطالعہ نہایت وسیع تھا وہ بڑی تلاش اور جستجو سے اپنی تصانیف کا مواد جمع کرتے تھے۔ انداز نگارش نہایت متین اور شگفتہ تھا' طرز استدلال میں عالمانہ شان اور وسعت نگاہ کی جھلک ہے' اس عہد کے مصنفین

ہیں وہ صف اول کے مصنف قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

یاد ایام، مولانا کی آخری تصنیف ہے جو انھوں نے سر راس مسعود کے ایماء پر لکھی تھی۔ سر راس مسعود ۱۹۳۵ء میں وزیر تعلیم ہو کر بھوپال آئے تھے اور ۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو بھوپال ہی میں ان کا انتقال ہوا، اور لاش علی گڑھ لے جاکر سپرد خاک کی گئی، راس مسعود کے سانحۂ ارتحال کے متعلق مولانا کے یہ الفاظ نہایت اثر انگیز ہیں:۔

"عجب اتفاق ہے کہ سید مسعود کو تین برس کی عمر میں میں نے گود میں لیا تھا اس کے بعد کامل پینتالیس ۴۵ سال کے بعد بھوپال ریلوے اسٹیشن کے پُل پر ان کے تابوت کو اُٹھایا اور پلیٹ فارم سے ریل کے ڈبے میں سوار کیا۔"

(یاد ایام ۳۹)

یاد ایام سرسید سے شروع ہو کر راس مسعود پر ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا نے اس کا خاتمہ ۲ مئی ۱۹۴۵ء کو تحریر کیا ہے، اور کتاب دسمبر ۱۹۴۶ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے۔

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

مرتبہ

مومن نمبر

نیاز فتحپوری

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی، اس لئے اسکی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہل ذوق کیلئے لذت کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے۔ اس کا صحیح اندازہ

مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات معاشقہ، اس کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے کوئی کتاب، کوئی مقالہ، یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔ قیمت۔ چار روپے

منیجر:۔ نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

تاریخ اسلام میں غلاموں اور کنیزوں کی اہمیت

نیاز فتحپوری

اہل عرب لونڈیوں سے نکاح کرنا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ خلفاء راشدین میں سے کسی نے لونڈی سے نکاح نہیں کیا اور ان کے یہاں بیوی اور لونڈی کی حیثیت بالکل ایک دوسرے سے جدا تھی، یعنی وہ لونڈی سے نکاح کرنا تو پسند نہ کرتے تھے لیکن تھی دراصل وہ غیر منکوحہ بیوی جس سے اگر اولاد ہو جاتی تھی تو کبھی اس سے شادی کر لیتے تھے اور کبھی اس کو فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن حضرت عمر نے اُمّہات الولد کی فروخت کی ممانعت کر دی۔ لونڈیوں سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بھی حقیر ہی سمجھا جاتا تھا اور یہ رجحان اس وقت کم ہوا جب یزدجرد کسرائے ایران کی تین لڑکیاں جنگی قیدی کی حیثیت سے آئیں اور انھیں بھی حسب المعمول کنیز ہی قرار دیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ تھیں شاہی خاندان کی لڑکیاں اس لئے حضرت علی نے معمولی کنیزوں سے ممیز کرنے کے لئے انھیں خرید کر، ایک گیہانی بانو عبداللہ بن عمر کو دیدی جس سے قاسم پیدا ہوئے، دوسری غزالہ محمد بن ابی بکر کو جس سے سالم پیدا ہوئے، تیسری شاہ بانو یا شاہ زناں، اپنے بیٹے حسین کو جن کے بطن سے زین العابدین پیدا ہوئے۔ یہ تینوں کنیزیں تھیں لیکن ان تینوں کی حیثیت معمولی کنیزوں کی سی نہ تھی اور اسی وقت سے لونڈیوں کی حیثیت بلند ہوئی اور یہ رواج اتنا عام ہوا کہ بہت سے اکابر اُمت لونڈیوں ہی کے بطن سے ہوئے۔ خود سادات کو لیجئے کہ ان میں کتنے ہاشمی و قریشی ماؤں کے بیٹے تھے۔

سیدوں کا سلسلہ حسنؑ اور حسینؑ سے شروع ہوا ہے اور انہیں سے سلسلہ سادات چلا ہے۔ لیکن نسبی حیثیت سے ان کی اولاد کون اور کیا تھی۔ امام حسن نے تو خیر بیشمار شادیاں کیں اور طلاقیں دیں، چنانچہ حضرت علی ان کے اس طرز عمل سے خوش نہ تھے اور انھیں "مطلاق" یعنی بڑا طلاق دینے والا کہا کرتے تھے۔ ان کی بھی متعدد اولاد لونڈیوں کے بطن سے ہوئی (مثلاً عمرو۔ قاسم، عبداللہ، عبدالرحمان)

امام حسین کے صاحبزادہ زین العابدین کو لیجئے (جن سے سلسلہ سادات چلا ہے جو خود بھی کنیز زادہ تھے) ان کی تقریباً تمام اولاد بہ استثناء امام باقر لونڈیوں کے بطن سے ہوئیں۔ امام باقر کے بعد ان کے صاحبزادہ جعفر صادق کو لیجئے کہ ان کے جانشین حضرت موسیٰ الکاظم کی ماں حمیدہ بربریہ بھی "ام ولد" تھیں۔ اس کے بعد موسیٰ الکاظم کی تمام اولاد لونڈیوں کے بطن سے ہوئی۔ موسیٰ الکاظم کے بعد امامت علی بن موسیٰ الرضا کو ملی اور ان کی ماں بھی ام ولد تھیں۔

اسی طرح امام ابو جعفر (محمد تقی) کی ماں کے متعلق خود محمد باقر مجلسی کہتے ہیں کہ "مادرش ام ولدست و نام او سبکہ ہست۔ مشہور آن ست کہ نوبیہ ہست (بعض گویند مرسیہ) ہست"

امام محمد تقی کے بعد، امام نقی ان کے جانشین ہوئے ان کی ماں بھی لونڈی تھیں اور نام سمانہ مغربیہ تھا۔ اسی طرح امام حسن عسکری کی ماں ام ولد تھیں جن کا نام سوسن تھا، یا حسب بیان باقر مجلسی سنبلی یا غزالہ۔ اسی طرح آخری امام محمد بن حسن عسکری (معروف بہ محمد مہدی) کے متعلق باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ "مادرش ملیکہ دختر شیوعان فرزند قیصر روم بود ملقب بہ نرجس (نرگس) خاتون و بعض گویند دختر دید علویہ"

تمدن اسلامی کی تاریخ میں کنیزوں کی کثرت کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔ اور ان کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی ان میں سے بعض خلافت تک پہونچ گئے، جیسے مامون الرشید کہ یہ بھی کنیز زادہ تھا۔ متوکل عباسی کے پاس چار ہزار لونڈیاں تھیں اور ہارون الرشید کے پاس دو ہزار جن میں ۳۰۰ ماہر موسیقی تھیں۔

فاطمی خلفاء کے یہاں تو ترکی غلام شمار سے باہر تھے۔ الحاکم بامر اللہ کے قصر میں دس ہزار غلام و کنیزیں ہر وقت کمربستہ رہتے تھے، اور اس کی بہن ست الملک کے پاس آٹھ ہزار کنیزیں تھیں جن میں ۱۵۰۰ بالکل کنواری تھیں۔ چنانچہ جب صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلفاء کے محلوں پر قبضہ کیا تو صرف ایک قصر کسریٰ میں بارہ ہزار لونڈی غلام نظر آئے اور سالہا سال تک ان کی فروخت کا سلسلہ جاری رہا یہی حال ملوک سلاجقہ اور بنو امیہ اندلس کے درباروں کا تھا۔

لونڈیوں کی قیمت ان کے حسن و جمال، قابلیت و مہارت موسیقی کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہارون الرشید نے ایک کنیز ابراہیم موصلی سے ۳۶ ہزار دینار میں خریدی اور دوسرے دن فضل کے پاس بھیج دی۔ جعفر بن ہادی کے پاس ایک کنیز تھی جس کا نام بذل تھا محمد الامین نے اسے دس لاکھ دینار میں خریدا۔ اسی طرح عبدالملک اموی نے ایک کنیز سلامہ کے لئے جو بڑی خوش گلو ماہر موسیقی تھی ۲۰ ہزار دینار ادا کئے، اور دوسری کنیز ضیاء کے لئے ۵۰ ہزار دینار ——— جعفر برمکی نے ایک لونڈی ۴۰ ہزار دینار میں لی اور واثق باللہ نے کنیز صالحینہ کی قیمت دس ہزار دینار ادا کی۔ سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے ایک کنیز زلفاء کی قیمت ۷۰ ہزار دینار ادا کی۔

کنیزوں کے ساتھ خلفاء کا شغف اتنا بڑھ گیا تھا کہ امراء، تجار، اور اکابر قوم دربار خلافت میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے کنیزیں بہ کثرت بصورت تحائف فراہم کرتے رہتے تھے۔

صدر اسلام میں بھی جنگ کے قیدیوں کی حیثیت غلاموں کی سی تھی، ہزاروں گرفتار ہوتے تھے اور کوڑیوں کے مول فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ بنو امیہ کے عہد میں کثرت فتوح کے ساتھ ان میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۹۱ھ کی جنگ افریقہ میں موسیٰ بن نصیر نے تین لاکھ جنگی قیدیوں میں سے پانچواں حصہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس بھیجدیا۔ اور جب وہ اندلس سے لوٹا ہے تو ۳۰ ہزار نوجوان لڑکیاں اندلس کے شریف و امیر گھرانوں کی اس کے ساتھ تھیں۔

چونکہ جنگی قیدیوں کی اتنی بڑی جماعت کی نقل و حرکت کا انتظام بہت دشوار تھا اس لئے ہوتا یہ تھا کہ عورتوں اور لڑکوں کو بہت ارزاں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اندلس کی جنگ ارک کے مال غنیمت میں سے ایک ایک قیدی ایک ایک درہم میں، ایک ایک تلوار نصف درہم میں اور ایک ایک اونٹ پانچ پانچ درہم میں فروخت ہوا۔

غلامی کی کثرت کا رواج علاوہ جنگی فتوحات کے اس لئے اور بھی بڑھا کہ ترکستان و بلاد بربر سے وہاں کے عمال ہر سال لونڈی غلام بھی تحفتاً دربار خلافت میں بھیجتے رہتے تھے۔

صدر اسلام کا یہ دستور تھا کہ مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال چلا جاتا تھا اور باقی لشکر کے سرداروں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ بعد کو مختلف زمانوں اور حکومتوں میں یہ دستور بدلتا رہا۔ چنانچہ فاطمی حکومت مصر کے زمانہ کا یہ دستور تھا کہ جب عساکر اسلامی قاہرہ ساحل نیل پر پہونچتیں تو مرد قیدیوں کو ایک خاص جگہ ٹھہرا دیتیں جس کو مناخ کہتے تھے اور عورتوں اور لڑکوں کو خدمت اور گھر کے کام کاج کے لئے تقسیم کر دیا جاتا تھا جن کا ایک بڑا حصہ قصر خلیفہ پہونچ جاتا تھا۔ کمسن لڑکوں کو لکھنے پڑھنے اور فنون سپہگری کی تعلیم دی جاتی تھی اور ایسے لڑکوں کو مُرَبّی کہتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکے جوان ہو کر بلند مرتبوں تک پہونچ جاتے تھے۔

قیدی جنگیوں کو غلام بنا لینے کا دستور صرف مسلمانوں ہی میں نہ تھا بلکہ دوسری حکومتوں میں بھی تھا اور وہ بھی مسلمان جنگی قیدیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے تھے۔ قیدیوں کے باہم تبادلہ کا بھی دستور تھا اور زر فدیہ دیکر بھی انہیں واپس لیا جاتا تھا، جس کا باضابطہ آغاز پہلے ہارون الرشید کے زمانہ میں ہوا (۸۰۹ء) اور اس کے بعد ڈیڑھ سو سال تک یہ دستور بڑھتا ہی گیا اور مسلم اُمراء نے زر فدیہ دے دیکر بہ کثرت مسلم قیدیوں کی آزادی حاصل کی۔

رومی حکومت اپنے قیدیوں کی رہائی کی کم فکر کرتی تھی کیونکہ ان میں رومی قوم کے افراد بہت کم ہوتے تھے زیادہ تر رعایا کے افراد ہوتے تھے۔ جس کا ایک سبب مسلمانوں میں غلاموں کی افراط کا ہوا اور عام سپاہیوں کے پاس بھی کئی کئی غلام ہو گئے۔ چہ جائیکہ اُمراء و حکمران کے غلاموں کی تو کوئی انتہا نہ رہی۔ اور جب وہ باہر نکلتے تھے تو سیکڑوں غلام ان کے جلو میں ہوتے تھے، چنانچہ رافع بن ہرثمہ والی خراسان چار ہزار غلاموں کا مالک تھا۔

ان قیدیوں میں سے بعض تو ذاتی خادم کی حیثیت رکھتے تھے اور بعض فوجی تعلیم و تربیت حاصل کر کے اونچے درجوں تک پہونچ جاتے تھے۔ چنانچہ احمد صاحب مصر کے پاس ایسے آٹھ ہزار مسلح و تربیت یافتہ غلام تھے جن میں سے دو ہزار رات کے وقت قصر کا پہرا دیا کرتے تھے اسی طرح غلاموں کی متعدد افواج بن گئیں تھیں اور تعلیم یافتہ و ہوشیار غلام ایک ایک ہزار دینار میں فروخت ہوتے تھے۔

جو غلام ذاتی خدمت کرتے تھے ان میں فراش، باورچی، نقیب، دربان ہوتے تھے۔ ان میں ترکی، فارسی، بربری، زنگی اور سلافی سبھی شامل ہوتے تھے۔ ان میں بعض نو عمر لڑکے زینت مجالس کا کام بھی دیتے تھے اور بڑے خوش نما لباس میں رہتے تھے۔ اس کا امین کو بہت شوق تھا۔ پھر یہ ذوق بڑھتا ہی رہا، چنانچہ المقتدر باللہ کے زمانہ میں ان کی تعداد گیارہ ہزار تک پہونچ گئی۔ جن میں ایرانی، دیلمی، ترک، مصری وغیرہ سبھی ہوتے تھے۔

تاریخ تمدن اسلامی میں کنیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو عورتیں یا لڑکیاں جنگ میں گرفتار ہوتی تھیں، وہ فاتحین کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں خواہ وہ کسی خاندان کی ہوں۔ اور ان کی حیثیت خادمہ کی سی ہوتی تھی جس سے وہ جنسی تعلق کا بھی کام لے سکتے تھے اور فروخت بھی کر سکتے تھے اور اولاد ہونے کے بعد شادی بھی کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ رواج اس قدر عام ہوا کہ انہیں خلفاء و امراء کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی گئی۔ وہ کنیزیں جو زیادہ حسین و جمیل اور ماہر موسیقی ہوتی تھیں، خلفاء کے حضور میں پیش کر دی جاتی تھیں، ——— اور ان سے اولاد ہوتی تھی، چنانچہ اکثر عباسی خلفاء انھیں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ چنانچہ ایک کنیز دنانیر جو کلاسیکل موسیقی کی ماہر تھی جعفر برمکی نے بڑی قیمت دیکر خریدی تھی اور اس کا گانا سننے کے لئے رشید اکثر جعفر کے گھر آتا جاتا تھا اور انعامات دیتا رہتا تھا۔ یہ بات زبیدہ کو پسند نہ آئی اس لئے رشید کو مالوف کرنے کے لئے اس نے بڑی بڑی حسین و صاحب کمال دس کنیزیں پیش کیں۔ ان میں ایک ماردیہ (معتصم کی ماں) مراجل (ام مامون) اور فاردہ (ام صالح) بھی تھی۔

حال و امراء بھی تقرب حاصل کرنے کے لئے کنیزیں پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابن طاہر نے خلیفہ المتوکل کو ۲۰۰ کنیزیں پیش کیں۔ لیکن یہ سب یادگار تھی تمدن قدیم کی۔ ملوک روم و فارس کے درمیان بھی یہ رسم جاری تھی اور باہم گر کنیزوں کے تحائف پیش کرنے کا برابر رواج پایا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ مستقل ادارے ان کی تجارت کے قائم ہو گئے۔ تجار مختلف ممالک سے لونڈیاں خرید کر لاتے، انھیں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے اور بڑی گراں قیمت پر فروخت کرتے۔ زیادہ حسین و تربیت یافتہ لونڈیوں کی بڑی قدر تھی اور خلفاء و اُمراء کے یہاں پہونچ کر بڑا اقتدار حاصل کر لیتیں۔ بغداد اس تجارت کا بڑا مرکز تھا۔

ان میں شعر و ادب اور موسیقی کی تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ابراہیم موصلی اور اس کا بیٹا اسحاق چند دینار دیکر ذہین و چھل کمسن لڑکیاں خرید لیتے اور ان کو فنون لطیفہ کی تعلیم دے کر ہزاروں دینار میں فروخت کرتے۔ مدینہ، بصرہ، بغداد ان کا گھر تھا، جنھیں تحفتاً خلفاء کے حضور میں بغرض تقرب پیش کیا جاتا۔

خلفاء و بنوامیہ البتہ اوّل اوّل اس طرف متوجہ نہیں ہوئے اور لونڈیوں کے تحائف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً امیر معاویہ، منصور اور عبدالرحمان الداخل۔ لیکن اس کے بعد کنیزوں کا اقتدار و تسلّط اس خاندان پر بھی ہو گیا، چنانچہ یزید بن عبدالملک تو اپنی کنیز حبابہ کا غلام ہی ہو گیا تھا اور پھر عہد عباسیہ میں تو لونڈیوں کا اقتدار انتہا کو پہنچ گیا، یہاں تک کہ ایک بار "ذات الخال" نے سات سال تک کا خراج فارس کا اپنے باپ کے نام لکھوا لیا۔

لونڈیوں سے جاسوسی کا کام بھی لیا جاتا اور ان کے ذریعہ سے درباروں کے حالات معلوم کیے جاتے ـــــ ان میں سے اگر کسی کے اولاد ہو جاتی تو اس کی بڑی قدر ہو جاتی۔

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

ماجدولین نمبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دل دوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے ادب لطیف میں آپ کو نظر نہ آئیگی

اسے پہاڑوں نے سُنا اور کانپ اُٹھے　　زمین نے سُنا اور تھرا اُٹھی!

خدا نے سُنا اور تا دیر ملول رہا

محبت کا خراج صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے اُمنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں۔　　قیمت صرف تین روپے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ ۔ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

لکھنؤ

(محمد عمر)

ابتدائی تاریخ

لکھنؤ کی ابتدائی تاریخ کا بالکل پتہ نہیں چلتا جو کچھ معلومات اس سلسلے میں دستیاب ہوئی ہیں وہ قصّوں اور روایتوں پر مبنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ رام چندر کے بھائی لچھمن نے یہ شہر آباد کیا تھا اسی وجہ سے اس کا نام لچھمن وتی یا لچھمن پور پڑا۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں بھی یہ مقام متبرک سمجھا جاتا تھا اور لچھمن ٹیلا کے نیچے جو گڑھا تھا لوگ اس میں پھول اور پانی نذر چڑھاتے تھے۔ آج بھی ہارڈنگ برج کے قریب یہ ٹیلا موجود ہے۔

ترکوں کے ابتدائی حملوں کے بعد اودھ کا علاقہ قنوج کے حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ تیرھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں مسلمان آکر یہاں آباد ہوگئے۔ رفتہ رفتہ شیخوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور بعد میں ان ہی لوگوں میں سے کئی اشخاص اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ انھوں نے ایک قلعہ تعمیر کروایا جو مضبوطی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ یہ قلعہ اس مقام پر تھا جہاں بعد میں مچھی بھون تعمیر ہوا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس قلعہ کا معمارِ خاص، لکھنا، نامی ایک ہندو تھا اور اسی شخص کے نام پر یہ مقام قلعہ لکھنا کے نام سے مشہور رہا۔

محمد بن تغلق کے زمانے میں یہ شہر لکھنا اور لکھنؤ دونوں ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے کی تاریخی کتابوں میں پہلی بار اس شہر کا نام لکھنؤ آیا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں جب دہلی میں قحطِ عظیم پڑا تو لکھنا یا لکھنؤ سے بھاری مقدار میں اناج دہلی بھیجا جاتا تھا۔

۱۵۲۶ء میں شہزادہ ہمایوں نے لکھنؤ شہر پر قبضہ کیا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اسے وہاں سے واپس آنا پڑا اور یہ شہر پھر افغانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۵۲۸ء میں بابر نے از سرِ نو اس شہر پر قبضہ کیا اور خود بھی وہاں گیا۔ شیر شاہ نے قادر خاں کو جو بعد میں بہت طاقتور سردار بن گیا تھا۔ اس شہر کا حاکم بنایا اور اس نے یہاں سونے چاندی کی ٹکسالیں قائم کیں۔ چونکہ اکبر بادشاہ کو یہ مقام بہت پسند تھا، اس سبب سے اس شہر نے بڑی اہمیت حاصل کرلی۔ تانبے کی ٹکسال بدستور وہاں قائم رہی۔ کہا جاتا ہے کہ چوک کے شمال میں اکبر نے کئی محلے آباد کئے تھے۔

لکھنؤ کے شیخ زادوں میں شیخ عبدالرحیم کو اکبری عہد میں ہفت صدی منصب کے علاوہ ایک جاگیر بھی عنایت ہوئی۔ اس نے پنچ محل اور مچھی بھون دو عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس زمانے سے سعادت خاں برہان الملک وزیر کے زمانے تک لکھنؤ کی جاگیر شیخ عبدالرحیم کے جانشینوں کے قبضے میں رہی۔ مختصر یہ کہ اکبر کے دورِ حکومت میں اسے ایک سرکار کا درجہ حاصل ہوا۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں یہ شہر کمانوں کی صنعت کے لئے بہت مشہور تھا۔ جہانگیر نے مرزا منڈی محلہ آباد کیا۔ اسی زمانے کے ایک سیاح کا بیان ہے کہ لکھنؤ ایک تجارتی مرکز تھا اور آگرہ اور جون پور کو جوڑنے والی سڑک پر واقع تھا۔ شاہ جہاں نے سلطان قلی خاں کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا اور اس کے لڑکوں مرزا فاضل اور مرزا منصور نے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کئے۔ معتمد خاں کے بھائی محمد اشرف نے لکھنؤ میں شاندار عمارتیں، ایک سرائے اور اشرف آباد کے مکانات کے علاوہ عوام کے لئے ایک باغ لگوایا۔ اس کے بھائی نے مشرف آباد یا نولبستہ آباد کیا۔ ایک دوسرے سردار پیر خاں نے گڑھی پیر خاں تعمیر کروائی جو شہر کے مغرب میں واقع ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اجودھیا سے واپسی کے موقع پر اورنگ زیب لکھنؤ گیا تھا اور لچھمن ٹیلا کے اوپر ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جو آج بھی بطور یادگار باقی ہے۔

قیام اودھ

اودھ کی آزاد حکومت کے بانی کا اصلی نام میر محمد امین تھا۔ وہ شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ایران سے ہندوستان آیا (۱۷۰۸ء — ۱۷۰۹ء) محمد شاہ کے عہد میں اُسے اودھ کی صوبیداری تفویض ہوئی اور نواب برہان الملک سعادت خاں کا خطاب ملا۔ اس کی وفات (۱۷۳۹ء) کے بعد اس کے داماد نواب منصور خاں کو نواب صفدر جنگ کے خطاب کے ساتھ اودھ کی مسند پر فائز کیا گیا۔ اس کا جانشین شجاع الدولہ ہوا۔ اس کے زمانے میں اودھ حکومت کے حدود وسیع ہوئے اور اس نے روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کو شکست دے کر اس کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

بکسر کی شکست کے بعد انگریزی فوجی دستہ لکھنؤ میں رہنے لگا جس کے اخراجات اودھ سرکار کو برداشت کرنے پڑتے تھے، رفتہ رفتہ انگریزوں نے یہ علاقہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور واجد علی شاہ کو ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے کلکتہ بھیجدیا۔ انھوں نے تیس سال کلکتہ میں زندہ رہنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں ۶۸ سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔

جب دلّی اُجڑی اور دلّی کے مہاجرین لکھنؤ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے تو انھوں نے پہلی بار اس شہر کو دیکھا اور اسے دلّی سے بہت ہی کم درجے کا شہر پایا۔ اس وجہ سے اس دور کے ادب میں اس شہر کی بہت ہی مذمت ملتی ہے۔ میرؔ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کے بجائے دلّی ہی میں مرجانا بہتر تھا۔

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی گلزار ارم میں اس شہر کی خرابیوں کو بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا — لگا اس جا پہ ہرگز جی نہ میرا
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا — ولے جا گرچہ بد ہو تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

برسات کے زمانے میں اس شہر کا بہت بُرا حال ہوتا تھا۔ کشتی اور ڈونگوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسرے مقام پر پہنچنا ممکن ہوتا تھا۔ اظفری اور میر حسن دہلوی نے بڑی تفصیل سے برسات کے زمانے میں لکھنؤ کا منظر پیش کیا ہے۔ میر حسن دہلوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے باوجود لکھنؤ میں زندگی خطرات سے بھری ہوئی تھی۔ شہر میں بھیڑیئے گھس آتے تھے اور بچوں کو اُٹھالے جاتے تھے:-

زبس افراط ہے یاں بھیڑیوں کا — سدا دھڑکا ہے یوسف طلعتوں کا
رکھے ہے جو کوئی فرزند و اطفال — ہوا ہے اس کو رہنا یاں کا جنجال
سحر تک شام سے رہتا ہے دھڑکا — مبادا بھیڑیا لے جائے لڑکا

آصف الدولہ کا لکھنؤ

موجودہ لکھنؤ کا عروج آصف الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ دریائے گومتی کے کنارے دولت خانہ بنوایا۔ اس عمارت میں اب صرف آصفی کوٹھی

باقی رہ گئی ہے۔ اس نواب کے اعلیٰ تعمیری کارناموں میں بڑا امام باڑہ۔ ایک بڑی مسجد اور رومی دروازہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان عمارتوں کی چھتوں میں لکڑی کا نام تک نہیں۔ سب چھتیں ڈاٹ کی ہیں۔ امام باڑہ کی عمارت تعمیرات لکھنؤ میں سب سے بہتر ہے۔ نواب نے بے حساب روپیہ اس کی تعمیر میں صرف کیا تھا۔ اس کا خرچ دس لاکھ روپیہ بتایا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے دُور دُور سے کاریگر مہیا کئے گئے تھے۔ یہ عمارت اسی قدر مضبوط بھی ہے جتنی خوبصورت اور خوش قطع ہے۔ اس کے دالان کا طول ساٹھ گز اور عرض بیس گز ہے۔ اسکی چھت ایک سو بیس فٹ چوڑی بالکل بے ستون کھڑی ہے۔ وفات کے بعد آصف الدولہ کو یہیں دفن کیا گیا۔ لاکھوں روپے کا قیمتی اسباب اس امام باڑے میں سجایا گیا۔ ۱۷۸۴ء میں رومی دروازہ کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ یہ دروازہ روم کی نقل ہے۔ دور سے یہ دروازہ تعمیرات کا ایک عمدہ نمونہ نظر آتا ہے۔ بڑی مسجد بہت خوبصورت ہے۔ علاوہ ازیں اس نواب نے باغ اور باغیچے، بارہ دریاں، نہریں، حوض، پانی کے خزانے، فوارے، حمام خشتی اور سنگین اور شیشے کا محل اور ہاتھی دانت کا بنگلہ بنوایا۔ نواب سعادت علیخان کو نئی عمارتیں جدید نقشوں پر بنوانے کا بہت شوق تھا اور چاہا کہ کلکتے کی وضع کا ایک نیا شہر بنوائے۔ اس وجہ سے شہر اور بی بی پور کے درمیان میں جہاں کی زمین کچھ بلند اور کچھ ہموار تھی عمارات بنوانی شروع کیں۔ اس نے فرح بخش، کوٹھی دل کشا، موتی محل، شاہ منزل خورشید منزل، ماہ منزل، کوٹھی حیات بخش، کوٹھی دار الشفا۔ کوٹھی بیگم، کنکر والی کوٹھی۔ کوٹھی نور بخش، چینی بازار، ٹیڑھی کوٹھی بنوائیں ان مکانات میں اکثر صاحبزادے سکونت رکھتے تھے۔ اس نواب نے کئی باغ بھی لگوائے۔ ان میں موسیٰ باغ بہت مشہور ہے۔ چوں کہ وہ نواب کی سیرگاہ تھا اور اس میں حیوانات کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ نواب نے ان کوٹھیوں کو آلات شیشہ سادہ و منقش اور آئینے قدآدم سے اونچے اور انگریزی باجوں اور گھڑیوں سے سجایا تھا۔ اور باغوں میں قسم قسم کے میووں کے درخت لگوائے تھے۔

غازی الدین حیدر نے قیصر باغ کے مقبرے، مبارک منزل (یہ کوٹھی کنارۂ دریا پر تعمیر کرائی تھی) قدم رسول، کی عمارت ایک بلند مقام پر بنوائی۔ اس میں ایک سنگ پارہ تھا۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر آنحضرت کے قدم کا نقش تھا۔ غدر میں یہ سنگ پارہ گم ہو گیا۔ نجف اشرف وہ عمارت ہے جس میں غازی الدین حیدر دفن ہیں۔ ولایتی باغ کے علاوہ شہر کے جنوب میں ایک نہر کھدوائی تھی۔ نصیر الدین حیدر نے چھتر منزل، محلاتِ حرم کی سکونت کے واسطے تعمیر کرائی۔ اس کوٹھی کا نام چھتر منزل اس واسطے پڑا کہ اس کے اوپر چتر طلائی بنے تھے۔ تاروالی کوٹھی جس میں آلاتِ نجوم بھی رکھے گئے تھے اور امام باڑہ ملحق عمارات چھتر منزل ان ہی کی عہد سلطنت کی یادگار ہیں۔ ولایتی باغ بھی لگوایا تھا۔ جس میں اکثر ولایتی درخت لگوائے تھے۔ واجد علی شاہ نے اس کی چاردیواری کو بلند کروایا تھا۔ کیونکہ ان کی بیگمات اکثر وہاں سیر و تفریح کے لئے جایا کرتی تھیں۔

محمد علی شاہ نے ۱۲۵۳ھ میں جمنیا باغ میں ایک امام باڑے کی بنیاد ڈالی جو حسین آباد کے نام سے مشہور ہے۔ لاکھوں روپے اس میں صرف ہوئے تھے۔ یہ عمارت محمد علی شاہ نے اپنے دفن ہونے کے لئے بنوائی تھی۔ امام باڑہ میں داخل ہونے کا راستہ ایک بازار کے درمیان سے جاتا ہے۔ ایک سفید دروازے سے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازے سے داخل ہونے کے بعد ایک بہت بڑا صحن ملتا ہے جس کے بیچ میں ایک چوکور تالاب بنا ہوا ہے۔ عمارت کے چاروں کونوں پر تاج محل کے چھوٹے چھوٹے نمونے تعمیر ہیں۔ ان میں سے ایک میں محمد علی شاہ کی لڑکی زینت مدفون ہے اور دوسرے میں اس کے شوہر کی اشیاء محفوظ ہیں۔ محرم میں اس عمارت پر روشنی ہوتی ہے۔ حسین آباد کے مغرب میں بڑی مسجد اور جامع مسجد کی بنیاد بھی اسی بادشاہ نے ڈالی تھی لیکن ملکۂ جہاں بیگم نے ان کی تکمیل کرائی۔ دیواریں نقش و نگار سے مزین ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے ایک اور عمارت کی تعمیر شروع کی جس کو نوکھنڈ کہتے ہیں۔ ارادہ تھا کہ اس کو سات منزل کی بنوا کر اس کے اوپر سے تمام عمارات شاہی کی سیر کیا کریں مگر یہ بھی نامکمل رہ گئی

صرف چار مرثیے اس کی پوری ہو سکی تھیں۔ امجد علی شاہ نے حضرت گنج کا امام بارہ بنوایا تھا جس میں وہ خود مدفون ہے۔

واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ایک باغ تعمیر کروایا اور اس کو بڑے تکلف سے آراستہ پیراستہ کروایا۔ اس میں ایک حوض بنوایا گیا جس کا طول چالیس گز اور عرض پندرہ بیس گز تھا۔ اس میں فوارے لگائے گئے اور اس کو حضور باغ خطاب دیا گیا۔ ایک چھوٹا سا مکان موسم سرما کی رہائش کے لئے بنوایا گیا۔ علاوہ ازیں موسم گرما کے لئے ایک دوسرا مکان جس میں ہر طرف سنگ مرمر کا فرش تھا۔ اس کا خطاب مکان خاص مقرر ہوا۔ موسم برسات کے لئے فلک سیر نامی مکان تعمیر ہوا۔ قیصر باغ ایک اعلیٰ پیمانہ کی تعمیر عہد واجد علی شاہ کی ہے۔ یہ کام سنہ ۱۸۴۸ء میں شروع ہو کر سنہ ۱۸۵۰ء کو ختم ہوا۔ اور اسی لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ ان عمارات اور باغات کے سبب سے پرانے لکھنؤ نے موجودہ لکھنؤ کی صورت اختیار کی اور اپنی خوبصورتی، آبادی وغیرہ کے لحاظ سے نادر شاہ کے حملے سے پہلے کی دلی کا مقابلہ کرنے لگا۔ اس دور کے لٹریچر میں لکھنؤ کی بڑی تعریف ملتی ہے۔

کیا اور مصحفی میں کروں وصف لکھنؤ
روئے زمیں پہ اب یہ صفاہاں ہے دوسرا (مصحفی)

آصف الدولہ کے بعد لکھنؤ کی تباہی کا آغاز ہوتا ہے اور اس کی تکمیل واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ہوتی ہے۔ شاہ کمال نے اس تباہی و بربادی کا بڑے دلدوز پیرائے میں مرثیہ لکھا ہے۔

تہ و بالا ہوا وہ ملک سارا — دخیل اس میں ہوا آکر نصاریٰ
یہ ویراں آہ ہندوستاں ہوا سب — جہاں سارا فرنگستاں ہوا سب
غرض عمدہ تھے وہ جتنے کہ سردار — کیا ان لوگوں نے سب کو بیکار (شاہ کمال)

اس تباہی و بربادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی طرح لکھنؤ کی سماجی زندگی میں ایک بڑا انقلاب و انتشار رونما ہوا۔ واجد علی شاہ کے بعد لکھنؤ پر جو بلائے ناگہانی نازل ہوئی تھی قلق نے ایک مرثیہ میں اس کا منظر پیش کیا ہے۔

دلی کے تمام اہل حرفہ تلاش معاش میں دلی سے ہجرت کر کے پہلے فیض آباد اور پھر دور آصفی میں لکھنؤ پہنچے اور اس طرح دلی کی صنعت و حرفت وہاں پہنچی۔ لکھنؤ کی ثروت کی وجہ سے ان صنعتوں میں جدت اور تنوع پیدا ہوا۔ انشار کا بیان ہے کہ "چونکہ پوشاک کے فیشن میں نئی تراش خراش اور دوسری چیزوں میں جدت فارغ البالی کی حالت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور شاہ جہاں آباد والے نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ جبکہ لکھنؤ والے اعلیٰ مراتب اور ثروت پر فائز ہیں۔ اس صورت میں ان دہلی والوں کا سلیقہ جو لکھنؤ میں ہیں کیوں نہ ان دہلویوں کے سلیقے سے زیادہ ہو جو بے چارے شاہ جہاں آباد میں رہتے تھے"۔

لکھنؤ کی صنعتیں

دور آصفی سے پہلے لکھنؤ صرف کمان سازی کے لئے مشہور تھا، لیکن اس عہد سے یہاں صنعت و حرفت میں بالخصوص کپڑے کے کاموں میں نئی نئی ایجادیں ظہور میں آئیں۔ مثلاً بادلہ و مقیش بہت باریک خوش رنگ کار دوزی کا کام بہت پاکیزہ و صاف ستھرا، چنانچہ ہر قسم کا تاج، چوگوشیہ، ہشت گوشیہ و شش گوشیہ، علاوہ ازیں تاج ہمری بھی تیار ہوتا تھا۔ دستہ و تکمۂ قبا، مندیل و شملہ زر دوزی سینہ بند، نیم تنہ، پشواز، پیشواز و شلوار، دوپٹہ (زنان) ٹپکۂ علم، گھیتلا جوتا اور بوٹ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ سوتی اور ریشمی کپڑے بہت عمدہ و نفیس تیار ہوتے تھے۔ زیورات، مٹی اور تانبے کے برتن خوب بنتے تھے۔ چوڑی سازی بھی لکھنؤ کی ایک اہم صنعت تھی۔

ہندو تہوار

دسہرے کے دن رام اور راون کی جنگ کا واقعہ ایک بڑے میدان میں اسٹیج کیا جاتا تھا جس میں رام کی فتح کا منظر دکھایا جاتا تھا۔ راون کا مجسمہ جلایا جاتا اور چاروں طرف سے اس پر کنکر اور مٹی کے ڈھیلے پھینکے جاتے تھے۔

اس دن کھتری لوگ بالخصوص نفیس لباس زیب تن کرتے اور برہمن لوگ جو کے ہرے پودے لے کر پھولوں کی بجائے اپنی دستار میں لگاتے تھے۔ اس دن نیل کنٹھ کو دیکھنے کے لئے لوگ شہر کے باہر جاتے اور اس کا دیکھ لینا اپنے لئے سرمایہ دولت سمجھتے تھے۔

سلونو کے دن بہنیں جھوٹے مروارید سے مزین ریشم زری کے تاروں کی راکھی بنا کر بھائیوں کی کلائیوں میں باندھتی تھیں۔ اس تہوار کے موقع پر لڑکوں کا رقص ہوتا تھا۔ دیوالی کے زمانے میں مکانوں کے در و دیوار پر طرح طرح کے پھول بوٹے اور تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ گھروں پر روشنی اور چراغاں ہوتا۔ جنم اشٹمی کے موقع پر کنہیا کی مورتی ایک پاک و صاف مقام پر رکھی جاتی اور اس مورتی کے سامنے ہندوستانی مٹھائیاں اور خربوزہ کے بیج شکر میں بھون کر بطور پرشاد چڑھایا جاتا تھا۔ اگلی صبح کو خوب صورت اور نازک اندام لڑکوں کو زنانہ و مردانہ لباس پہنا کر بڑی دھوم دھام سے جلوس کی صورت میں باہر نکالتے تھے اور ایک مقام پر لے جاتے تھے۔ کاغذ کا ایک مجسمہ بنا کر اسے کنس کا نام دیتے تھے۔ کنہیا اور کنس کے درمیان جنگ کا منظر پیش کرتے اور کنس کی شکست دکھائی جاتی تھی۔ ہولی کے ایام میں ٹیسو کے پھولوں کا رنگ تیار کیا جاتا تھا اور راہ گیروں پر بلا تفریق مذہب و ملت رنگ پاشی کی جاتی۔ صاحب ثروت لوگ قمقموں میں گلابی بھر کر خوش اندام عورتوں پر مارتے تھے۔ لوگوں کو رنگین پانی کے گڑھوں میں ڈبا دیا جاتا۔ یہ مذاق خاص طور پر ڈیوں ان کے سازندوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ بسنت کا جشن سات دن تک منایا جاتا تھا۔ گانے والے مٹی کے برتنوں میں سبز خوشے اور گل شرشف ڈال کر روزانہ کسی نہ کسی بزرگ کے مزار پر جاتے اور بسنت کی تہنیت اور صاحب مزار کی مدح میں اشعار پڑھتے۔

ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی انگرکھا اور قبا بائیں جانب باندھتے تھے۔ امام باڑے بنواتے تھے اور عشرہ محرم میں تعزیہ داری کرتے تھے۔

اس طرح مسلمان بھی نیل کنٹھ کے دیدار کے لئے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اس موقع پر بندوقیں اور توپیں داغی جاتیں۔ دسہرے کے دن ہندو مسلمان بچے مل کر ٹیسو لئے ہوئے کا جلوس بڑی شان و شوکت سے نکالتے اور اسے ندی میں بہا کر اپنے گھروں کو واپس آتے نچلے طبقے کے مسلمان سلونوں کا بڑا اہتمام کرتے۔ لڑکوں کو رقص کراتے۔ دیوالی کے دن بہت سے مسلمان ہندوؤں کے شریک ہوتے قمار بازی اور گھروں پر چراغاں کرتے۔ شب دیوالی کو عورتیں سب بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتیں اور دیوالی بھرا کرتی تھیں۔ جنم اشٹمی کے دن کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے پیٹ میں شہد بھرتے تھے اور پھر اس کے پیٹ کو چاک کر کے اس شہد کو اس طرح پیتے جیسے کنس کا خون پی رہے ہوں۔ بسنت کے دن مسلمان زرد لباس پہنتے اور مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر رقص و سرود کا تماشہ دیکھنے جاتے۔ آصف الدولہ اور اس کے بعد کے نواب۔ بسنت کے تہوار میں ہر سال لاکھوں روپے صرف کر ڈالتے تھے۔ ہولی میں افغانوں اور بعض مسلمانوں کے سوا تمام مسلمان دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد سے لکھنؤ میں اس تہوار کا بڑا اہتمام ہونے لگا تھا اور دربار شاہی میں یہ جشن منایا جاتا تھا۔ تمام دن رنگ و گلال و عنبر اڑتا رہتا۔ ہولی کی رات کو دریا کے کنارے روشنی ہوتی اور آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔ میر اور لکھنؤ کے دیگر شعراء نے لکھنؤ کے دربار میں ہولی کے جشن کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ انشاء نے نواب سعادت علی خاں کی مجلس ہولی کو راجہ اندر کے اکھاڑے سے تشبیہ دی ہے۔

مگر انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی غرض سے قانونی طور پر ہولی کا رنگ مسلمانوں پر ڈالنا بند کر دیا تھا۔

میلے

آٹھویں میلے میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہوتے۔ ان کی عورتیں بھی جاتیں۔

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلہ ہے آج　　جاتیاں ہیں جو کچھا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں　　(انشار)

حضرت عباس کی درگاہ زیارت گاہِ خواص و عام تھی۔ واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی میں زیارتِ درگاہ کے لئے شاہی مستورات کے جانے کا بہت دلچسپ منظر پیش کیا ہے۔

ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں شادی کی رسموں میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا تھا۔ شب عروسی سے چند روز پہلے دولھا کو نہلا دھلا کر زعفرانی لباس پہناتے اور اتارا ہوا لباس نائی کو بخش دیتے تھے۔ اسی طرح لڑکی بھی نہلا دھلا کر آراستہ کی جاتی اور مالنیں ہرے پتوں کی مالائیں بنا کر طرفین کے مکانوں پر برائے شگون آویزاں کرتی تھیں۔ یہ دونوں رسمیں "بندھوا" اور "نائینی بیٹھانا" کہلاتی تھیں۔ اس زمانے میں لڑکا گھر سے باہر نہ نکلتا۔ بعد ازیں لڑکے اور لڑکی کے ہاتھ میں کنگنا باندھتے اور اسی دن سے دونوں گھروں میں ڈومنیوں اور طوائفوں کا رقص و سرود ہونے لگتا۔ دولھا کی ہونے والی سالیاں ایک مخصوص گانا گاتیں جو سٹھنی کہلاتا تھا۔ برات کی رات دولھا کو قیمتی اور عمدہ لباس پہنا کر، کاندھے پر شمشیر ڈال کر، سر پر پگڑی اور پیشانی پر سہرا باندھ کر، گھوڑی پر سوار کر کے اس کے ساتھ شہ بالا بٹھا کر باجے گاجے کے ساتھ، بڑی دھوم دھام سے روانہ کرتے تھے۔ لڑکی کے دروازے پر دھنگانا کی رسم ادا ہوتی، دولھا کو ایک تخت پر بٹھا دیا جاتا تھا رات کے آخری حصہ میں ہون ہوتا تھا۔ پھر برات جہیز اور لڑکی کے ساتھ واپس آتی تھی۔

لکھنؤ میں ہندوؤں کے تمام فرقوں میں شریف عورتیں اپنے سسر، جیٹھ، چچیرے بھائیوں اور ان کی اولاد سے، جو اس کے شوہر سے عمر میں بڑے ہوتے تھے، پردہ کرتی تھیں، کنیزوں اور خادماؤں کے سوائے اپنی ساس اور دیگر بزرگ عورتوں کی موجودگی میں بھی وہ نقاب ڈالے رہتی تھیں۔

مسلمانوں کے تہوار

ہندوؤں کے تہواروں میں تو مسلمان شریک ہوتے ہی تھے، اپنے تہوار بھی بڑی آن بان کے ساتھ مناتے تھے۔ عیدین کے موقع پر نوابین اودھ فوج پھاٹے، باجے گاجے کے ساتھ عید گاہ جاتے اور نماز کے بعد اسی شان و شوکت سے واپس آتے۔ دربار ہوتا۔ شعراء تہنیت نامے گزارتے اور انعامات حاصل کرتے۔ امراء نذریں پیش کرتے اور خلعتیں پاتے۔ اس موقع پر غرباء و مساکین کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ متموّل لوگوں اور امراء کے مکانوں پر طوائفوں اور ڈومنیوں کا رقص و سرود ہوتا۔ عزیزوں کے گھر ملنے کے لئے جاتے تھے۔ چونکہ نوابین اودھ شیعی عقائد کی طرف مائل تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ کے تہواروں میں محرم کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ تعزیہ داری دھوم دھام سے کرتے اور ہر سال کئی لاکھ روپے اس میں صرف کرتے تھے آصف الدولہ اور اس کے جانشینوں نے تعزیہ داری کے لئے امام باڑے تعمیر کروائے تھے۔ مسز میر حسن علی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمانوں کے رسم و رواج" میں محرم اور دوسرے تہواروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ساتویں محرم کو علم نکلتے تھے۔ آٹھویں اور نویں کو امام باڑوں اور شاہ نجف (مقبرہ غازی الدین حیدر) میں چراغاں ہوتا تھا۔ شیعہ مرد و عورت ان ایام میں ماتمی لباس زیب تن کرتے۔ عورتیں چوڑیاں توڑ ڈالتی تھیں اور زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں اور ہر قسم کے لوازمِ حسن کے استعمال سے پرہیز کرتی تھیں۔ عاشورہ کے دن بڑی دھوم دھام سے تعزیے نکالے جاتے۔ شیعہ اپنے تعزیے ایک خاص مقام پر دفنا دیتے جو آج کل تال کٹورہ کہلاتا ہے۔ سنیوں کے تعزیے وہاں دفن ہوتے تھے جو آجکل پھلکا تودہ کہلاتا ہے۔ ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ کو ماتم کا خاتمہ ہو جاتا تھا اور شیعہ حضرات تعزیے نکالتے تھے۔ اس جلوس میں کسی خاص قسم کے ماتم کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ خاموشی کے ساتھ جلوس آگے بڑھتا جاتا۔ آجکل یہ چپ تعزیہ کہلاتا ہے اور کاظمین میں پہنچ کر منتشر ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے مقاموں سے لوگ

لکھنؤ کی تعزیہ داری میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔

اشیائے خورد و نوش مثلاً شربت، ریوڑی، الائچی دانہ اور مالیدہ تعزیوں کے سامنے رکھ کر فاتحہ ہوتی اور شب عاشورہ کو حلوے سے بھرے کونڈے علموں کے سامنے رکھے جاتے۔ دوسرے دن صبح کو یہ حلوہ مساکین اور غربا میں تقسیم ہوتا تھا۔ تعزیوں کے سامنے سجدہ کرنا طواف کرنا اور منت ماننا اور بچوں کو نارنجی رنگ کے لباس پہنا کر تعزیوں کے نیچے سے نکالنا تاکہ وہ ہر قسم کی مصیبتوں سے محفوظ رہیں،

بارہ وفات یعنی یوم میلاد النبی پر بھی خاص اہتمام ہوتا تھا۔ چار شعبان کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے جلسے ہوتے۔ دربار میں امراء نذریں پیش کرتے اور حسب حیثیت خلعتیں پاتے۔ تیرھویں رجب کو حضرت علی کی ولادت کے جلسے منعقد ہوتے اور شاہ نجف میں روشنی ہوتی۔ شعبان کا تہوار منایا جاتا اور اس دن کشتی نما بانس کی کھپچیوں کا ایک مجسمہ بنا کر، سنہری اور روپہلی کپڑوں سے سجا کر اور اس میں روشن چراغ رکھ کر دریا میں چھوڑ دیتے تھے۔ اسے الیاس کی کشتی کہتے تھے۔ ان کشتیوں کو ایک شاندار جلوس، باجے گاجے اور فوج پھاٹے کے ساتھ دریا تک لے جایا جاتا تھا۔ دریا میں کشتیوں کے چھوڑنے کے موقع پر بگل اور نقارے بجائے جاتے تھے۔ ایرانی نوروز کا تہوار شمالی ہندوستان کے تمام شہروں میں منایا جاتا تھا۔ لکھنؤ میں چونکہ شیعوں کا مرکز تھا، اسی وجہ سے اور جگہوں کی نسبت یہاں یہ تہوار اعلیٰ پیمانے پر اور بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا تھا اس دن دربار ہوتا، امراء نذریں پیش کرتے اور 'نوروز مبارک' کے نعرے ہر طبقہ کے لوگوں میں بلند ہوتے۔ دن میں رقص و سرود کی محفلیں ہوتیں اور اشیاء خورد و نوش سے لوگوں کی تواضع ہوتی۔ عورتیں بھی اس جشن میں شریک ہوتیں اور رشتہ داروں میں مٹھائیاں تقسیم ہوتیں۔ نیا چاند ہر مسلمان کے لئے باعث مسرت ہوتا اور لوگ ایک دوسرے کو نئے چاند کی مبارک باد پیش کرتے۔ سورج اور چاند گرہن کے موقعوں پر مسلمان بآواز بلند اذان دیتے اور عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ عورتیں غلہ، تیل اور روپے پیسے غربا و مساکین میں تقسیم کرتیں۔ رمال کو انعام دیا جاتا۔ حاملہ عورتوں کو سونے نہ دیا جاتا اور اس موقع پر لوگ کئی طرح کے توہمات پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

سواریاں سواری کے لئے ہاتھی، گھوڑے اور بیل گاڑی اور مختلف قسم کی پالکیاں جن میں سنگھاسن اور سکھ پال زیادہ استعمال میں آتی تھیں۔ ڈولی پالکی سے نچلے درجے کی سواری تھی۔ تخت رواں، چنڈول اور ہوادار کبھی کبھی نوابین استعمال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں نالکی، رتھ، بیل گاڑی جن میں ناگوری بیل جوتے جاتے تھے۔ میانہ، محافہ، چوپالہ، کھڑکھڑ، تانگہ لہڑی، بھی سواری کے لئے کام آتی تھیں۔

بچے کی پیدائش سے اس کی وفات تک کے رسم و رواج کا سعادت یار خاں رنگین نے اپنی مثنوی موسومہ 'مسائلہ' میں ذکر کیا ہے۔

لباس نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے زمانے سے قبل دربار لکھنؤ کا لباس ہو بہو دربار مغلیہ کا لباس تھا مثلاً سر پر پگڑی، جسم پر نیم تنہ، ٹانگوں پر ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری پائجامہ اور پیروں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا۔ اور کمر میں جامہ کے اوپر پٹکا، اور گھروں میں امراء سر پہ ٹوپی اوڑھتے تھے۔ لکھنؤ کے ماحول کے اثر سے ان لباسوں میں یہ تبدیلی ہوئی کہ پائنچوں کے جوڑوں پر لمبی صراحیاں بنائی گئیں اور ان صراحیوں کے درمیان خوش نما چاند قائم کئے گئے۔ یہ چاند اور صراحیاں اس طرح سے بنائی جاتی تھیں کہ باریک تن زیب کے پائنچوں میں نین سکھ کی صراحیاں اور چاند کاٹ کر اندر کی طرف ٹانک دئے جاتے تھے جو ابھر نمایاں ہو کر ٹوپی میں اچھی نفاست، صفائی اور سادگی پیدا کرتے تھے۔ یہ ٹوپی لکھنؤ میں بہت پسند کی گئی اور عوام نے یکا یک پگڑی باندھنا چھوڑ دیا۔ ہر مہذب اور شائستہ آدمی کے سر پر یہی ٹوپی نظر آنے لگی۔

ٹیوننگ نے نواب آصف الدولہ کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب کے سر پر کلاہ اور اس پر پگڑی بندھی تھی، اس کے کاندھے پر ایک خوبصورت شال، جو اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی، پڑی تھی، اور پیروں میں سنہری زری کے جوتے تھے۔

غدر کے بعد لکھنؤ میں یکایک ٹوپیوں کی دنیا میں ایک انقلاب شروع ہو گیا۔ چند روز تک تو چوگوشیہ، دو پلڑی اور مندیلیں یا پگڑیاں ہی سر کا لباس تھا۔ اس کے بعد یکایک چوگوشیہ ٹوپی کا رواج اڑنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ دو پلڑی اور ترکی ٹوپی کا رواج ہوا۔ انگریزوں کے عہد میں تعلیم یافتہ لوگوں نے علی العموم گول مندیل نما فلٹ کیپ، اختیار کر لی تھی۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ مسلمانوں کے متمول طبقہ کے لوگوں نے انگریزوں کا لباس بھی اختیار کر لیا تھا۔

لکھنؤ کے شرفاء کا کل لباس، سر پر قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر انگرکھا اور پاؤں میں عرض کے پائنچوں کا پائجامہ کندھے پر ہلکا چکن یا جالی کا رومال اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا جس کی نوک بالکل نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان جوتوں پر سلمے ستارے کے کارچوبی کا کام ہوتا تھا۔ انشار نے دہلی اور لکھنؤ کے مردانہ لباس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لکھنؤ کا لباس بعینہٖ ایسا ہے کہ، کاندھلہ اور شاملی، بنیوں کی پوشاک کا ایرانی مرزاؤں کی پوشاک سے مقابلہ کرنا، وہاں کی پوشاک اگرچہ سوائے لکھنؤ کے اور شہروں پر غالب آ تی ہے"

لکھنؤ کی زنانہ پوشاک دہلی کے زنانہ لباس سے وضع قطع اور کپڑے کی نوعیت میں کہیں زیادہ عمدہ اور اعلیٰ تھی۔ انشار نے لکھا ہے کہ یہاں کی زنانہ پوشاک کے سامنے وہاں (دہلی) کی زنانہ پوشاک ایسی ہے جیسے میاں غلام رسول کے گانے کے سامنے لڑکے لڑکی کی شادی کے موقع پر بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کا گانا یا سرخ اطلس کے سامنے لال کھاروا۔

زنانہ لباس میں تراش خراش کے علاوہ یہاں کے کپڑے بہت نازک، بھڑکیلے اور رنگ برنگ کے ہوتے تھے، میر حسن کی مثنوی گلزار ارم سے معلوم ہوتا ہے کہ زنانہ لباس کے کپڑے، کناری، مسلسل، شبنم، کمخواب اور لاہی کے نام سے موسوم تھے۔ سر پر دوپٹہ۔ سینہ پر چولی یا انگیا جسم کے درمیانی حصہ میں کرتا یا کرتی کمر کے نیچے شلوار، کلی دار پشواز اور اکثر اوقات سینہ بند۔ کے اوپر نیم تنہ کے بجائے انگرکھا اور شاہ نواز خانی۔ اور موسم سرما میں پائجامہ گھوٹنہ، ورنہ عام طور پر چوڑی دار پائجامہ اور پیروں میں خوبصورت اور کامدار جوتیاں۔ آخری زمانے میں لہنگے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ گھتیلہ جفت کے بجائے بوٹ زردوزی یا مخملی۔

کھانے

عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ کے کھانے اور پینے کی اشیاء کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ چونکہ دہلی کے اجڑنے کے بعد صرف لکھنؤ ہی ایک ایسا مقام تھا جو اپنی فارغ البالی کے لئے مشہور تھا اور وہاں کے نواب اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ اس لئے تلاش معاش میں شمالی ہندوستان کے ہر حصّے سے وہاں باورچی بھی پہنچے اور انھوں نے اپنے فن کا خوب کمال دکھایا۔ یہاں بھی عام و خاص کھانے تو وہی تھے جن کا دہلی میں رواج تھا۔ مگر لکھنؤ میں اتنا فرق ہو گیا تھا کہ یہ لوگ چٹورے تھے اور ذائقہ دار مرغن کھانوں کی طرف بڑی رغبت رکھتے تھے۔ انشار نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کے امراء آدھا سیر پلاؤ کی تیاری میں بیس روپے صرف کر دیتے تھے۔ ایک تورہ سے جس میں ذیل کے کھانے شامل تھے، لکھنؤ کے مختلف کھانوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پلاؤ، مزعفر، متنجن، شیرمال، سفیدہ (میٹھے چاول) بورانی کے پیالے، شیر برنج کے خوانچے، قورمہ، تلی ہوئی اردیاں کو گوشت میں، شامی کباب، مربّہ، اچار یا چٹنی، علاوہ ازیں مختلف قسم کی دالیں اور مٹھائیاں۔

متوسط طبقے اور عوام کا کھانا بہت سادہ اور معمولی ہوتا تھا۔

لکھنؤ کے بازاروں میں پانی اور حقّے کی بہت دکانیں ہوتی تھیں۔ عوام کے لئے پانی اور حقہ دفع الوقتی کا بہت اچھا ذریعے تھے۔ دربار میں پانی اور حقّے سے مہمانوں کی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ محرّم کے ایّام میں مسلمان عورت اور مرد پان سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ عورتوں کیلئے

پان لوازم اضافۂ حسن میں شامل تھا۔ جب عورتیں میلے ٹھیلے میں جاتی تھیں تو ان کے ساتھ پاندان بھی ہوتا تھا۔

کسی کے ہاتھ پاؤں کی پٹاری   بھرا بٹوے میں کتھا اور سپاری   (میر حسن دہلوی)

شعروشاعری

دلی کی بساطِ شاعری اُٹھ کر لکھنؤ میں بچھی اور وہاں شعروشاعری و ادبی جلسوں کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہاں اردو شاعری کا اسکول قائم ہوا۔ شعراء میں سب سے پہلے سراج الدین علی خاں لکھنؤ پہنچے۔ بعد ازاں آصف الدولہ کا عہد آیا تو سودا، میر، جرأت، سوز، انشاء، مصحفی، رنگین، نسیم دہلوی، میر مستحسن خلیق، میر قمر الدین، میر جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیران اور دیگر شعراء نے لکھنؤ آکر قیام کیا۔ آصف الدولہ کی شعرا پروری کی تعریف میں جرأت کا شعر ملاحظہ ہو ؎

بزار شکر گئی سفلہ پروری کی رسم   جہاں میں اب شرفاؤں کا قدرداں آیا

نوابین اودھ کے علاوہ دہلی کے مفلوک الحال شہزادے اپنی عافیت کے لئے اور معاشی تنگی سے نجات پانے کی غرض سے لکھنؤ پہنچے اور وہ اپنے ساتھ اہلِ فنون کو بھی لے گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ خود بھی شاعر تھے اور شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے دربار سے انشاء، جرأت، مصحفی، مرزا نعیم بیگ جوان، میر صادق علی صادق، طالب علی خاں طالب، اور شیخ ولی محب وابستہ تھے۔ اسی طرح شہزادہ جہاندار شاہ المتخلص جہاندار، شاعر، بذلہ سنج، شوخ طبع اور رنگین مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ شاعروں کی قدردانی کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ آصف الدولہ سے واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں شعروشاعری کا بہت چرچا تھا۔ نوابین اودھ خود بھی اردو فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ واجد علی شاہ صاحب تصانیف تھے۔ انھوں نے متعدد دیوان، مثنویاں، مرثیے، سلام اور بے شمار نظمیں بطور یادگار چھوڑی ہیں، لکھنؤ میں بڑے اہتمام اور پابندی کے ساتھ مشاعرے ہوتے تھے۔ عوام بھی شعروشاعری میں بڑی دلچسپی لیتے۔ مجموعۂ نغز کے مؤلف کا بیان ہے کہ مہدی علی خاں عاشق لکھنوی کے ہاں بلاناغہ ہر جمعہ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ اتفاق سے ایک جمعہ کی صبح کو ان کے فرزند کی فاتحہ سیوم ہوئی۔ مگر بعد ظہر حسب معمول مشاعرہ کیا گیا۔

لکھنؤ کی فارغ البالی اور دربار سے شعراء کی وابستگی نے اردو شاعری کے معیار کو گرا دیا تھا۔ ہر طبقے کے لوگ عیش پرست اور ابتذال پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے شعراء کا کلام ابتذال، سوقیانہ پن اور رکیک تمثیلوں سے لبریز ہے۔ رنگین کی تمام ہجویات مثلاً "مخمس در ہجو ناصر ساکن ڈھاکہ"، یا "مثنوی در مذمت کہ در سلک نواب کریم اللہ خاں بہادر خلف نواب فیض اللہ خاں دیدہ بود" "مثنوی در ہجو کریلا بھانڈ"، مثنوی در حالِ زنِ فاحشہ وغیرہ ابتذال اور رکیک جذبات کی بدترین مثالیں ہیں۔

چونکہ وہاں کے نواب اور امیر ہمیشہ عورتوں کی صحبت میں رہتے تھے، اس سبب سے وہاں کی زبان بھی اس اثر سے نہ بچ سکی اور ریختی کی ایجاد ہوئی۔ جو عورتوں کی زبان ہے۔ اس زبان کا موجد سعادت یار خاں رنگین تھا۔ انشاء نے لکھا ہے کہ "سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختے کا آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا ہے، رنڈیوں کی بول اس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر مثنوی نہیں کپی سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔"

لکھنؤ کے اس شاعرانہ و تعیش پذیر ماحول سے عورتیں بھی متاثر تھیں اور شعروشاعری سے دلچسپی لیتی تھیں۔

لکھنؤ میں غزل کے علاوہ مراثی اور مثنویوں کی صنف میں قابلِ قدر اضافے ہوئے۔ انیس و دبیر نے مرثیہ کو ایک فن کی حیثیت دی۔ آتش و ناسخ نے اصلاح زبان کی کوشش کی لیکن اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ جذبات سے ہٹ کر الفاظ پر مرکوز ہوگئی۔

علم و ادب

قدیم الایام سے پورب کی سرزمین علم و ادب کے وصف میں ممتاز تھی۔ یہاں پانچ پانچ۔ دس دس کوس پر شرفاء اور نجبا کے دیہات آباد تھے۔ جن میں اعلیٰ پائے کے علماء و فضلا درس دیتے تھے۔ دور دور سے آکر طلباء یہاں تحصیل علوم کرتے تھے۔ سلاطین اور حکام وقت کی طرف سے ان مدارس کے مصارف کے لئے دیہات بطور معافی دئے جاتے تھے۔ طلباء کو وظائف اور علما کو زمینیں اور مدد معاش دی جاتی تھی۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ ۱۷۲۱ء تک جاری رہا۔ بعدازیں محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں برہان الملک اودھ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے تمام قدیم و جدید وظائف و سیور غال یک قلم ضبط کر لیں۔ بدیں سبب یہاں کے شرفاء و نجبا نے تنگیٔ معاش میں گرفتار ہو کر سپہ گری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چونکہ علم و ادب کی مجلسیں ان ہی لوگوں کی فراخ دلی کی مرہون منت تھیں۔ اس وجہ سے اب وہ مجلسیں بھی بے رونق ہو گئیں۔ مدارس اور طلبا منتشر ہو گئے۔ ارباب کمال تلاشِ معاش میں دوسری جگہوں کو چلے گئے۔ صفدر جنگ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا۔ بعد کے نوابوں کو علم و ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اس وجہ سے انھوں نے اس سلسلے میں کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ امجد علی شاہ کے عہد میں ایک مدرسۂ شاہی کی بنیاد پڑی تھی۔

وہاں کے علماء میں ملا نظام الدین سہالوی قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ ان کے ہی فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دارالعلم بنایا۔ ہندوستان میں عربی مدارس کا مشہور درس نظامیہ انھیں کی طرف منسوب ہے، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریباً ڈھائی سو سال تک علماء و فضلا پیدا ہوتے رہے، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی علم و فن کے لئے وقف کر دی۔ اسی خاندان کے فرد مولانا عبدالباری فرنگی محلی مہاتما گاندھی کے رفیق اور جنگ آزادی کے مجاہد تھے انھوں نے خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ مولانا شبلی نعمانی کا قائم کیا ہوا مدرسہ ندوۃ العلما آج بھی بادشاہ باغ میں گومتی کے کنارے موجود ہے اور ان دنوں اس کے ناظم عربی زبان کے مشہور عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

مختلف فنون

نوابین اودھ کے لئے تیراندازی، تلوار اور عوام کے لئے بانک پٹہ اور لکڑی بازی بہت ہی دلچسپ تفریحی مشاغل تھے، شہزادوں اور امیرزادوں کو ان فنون کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ لکھنؤ کے چند محلے مثلاً مفتی نگر، رستم نگر، محمود نگر اور منصور نگر کے نوجوان لڑکے روزانہ اپنا کچھ وقت بانک پٹہ، لکڑی بازی اور کشتی گیری کی تعلیم دمشق میں صرف کرتے تھے۔ لکھنؤ کے مروجہ فنون میں لکڑی کے جید استاد علی مد، محمد علی خاں اور میر نجم الدین تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ صرف شریف زادوں کو شاگرد بناتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد کے سب سے بڑے استاد میر عطا حسین تھے۔ ان کے علاوہ میر فضل علی اعلیٰ پائے کے استاد تھے۔ غلام رسول خاں کا لڑکا گوری پٹے باز، پٹے کا باکمال استاد تھا۔ اس کے علاوہ میر ولایت علی ڈنڈا توڑ اس فن کے ممتاز استاد تھے۔

عہد شجاع الدولہ میں بانک کے باکمال استاد منصور علی خاں نیکیت اور عہد آصفی کے شیخ نجم الدین اور میر بہادر علی و ولی محمد خاں تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شیخ نجم الدین کے شاگرد میر عباس بڑے پائے کے استاد تھے۔ اس فن کا آخری استاد میر جعفر علی تھا جو واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ چلا گیا تھا۔ بنوٹ کے استادوں میں محمد ابراہیم خاں رامپور اور طالب شیر خاں بہت مشہور تھے۔ مہدی علی خاں واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے۔ کشتی کے فن کے استاد ایک سید تھے جو اس فن میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، برچھا، بانا، تیراندازی اور کٹار بازی کے نامی گرامی استاد لکھنؤ میں تھے۔

لکھنؤ کے حکیموں میں حکیم احمد، حکیم ناصر علی، میر صادق، شفائی خاں، میر رضی، حسین رضا خاں۔ حکیم سید غلام علی، حکیم

تجمل عظیم خاں لکھنوی اور میر اعظم قابلِ ذکر ہیں۔

دیگر اہل فنون کی طرح دلّی سے اعلیٰ پایہ کے خوش نویس بھی لکھنؤ پہنچے اور ان کی شاگردی میں اس سرزمین سے عمدہ اور صاحب طرز خوشنویس پیدا ہوئے۔ مثلاً نواب تفضل حسین خاں، میر عطا حسین تحسین، مرزا احمد طباطبائی، حافظ نور اللہ، مرزا محمد علی، قاضی نعمت اللہ۔

معمر لوگ شطرنج اور چوپڑ یا چوسر بازی سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ چوپڑ بازی کا بیحد شوقین تھا اور میدان جنگ میں بھی اس شغل سے باز نہ آتا تھا۔ شمالی ہندوستان کے لوگوں کو پتنگ بازی سے بڑی دلچسپی تھی۔ بوڑھے، جوان اور بچے سبھی پتنگ اُڑاتے تھے۔ لکھنؤ میں پتنگ بازی کے شوق کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھل ہوتی، جو لوٹ کر لاتا اسے پانچ روپے دے کر تکل لے لی جاتی اور نہ لاتا تو بھی جہاں چاہتا پانچ روپے کا فروخت کر دیتا۔ پتنگ بازی کے پرانے استادوں میں میر عمدہ، خواجہ مٹھن اور شیخ اسد قابلِ ذکر ہیں۔

نوابین اودھ کے امراء نے درندے اور چوپائے جمع کر رکھے تھے۔ اور ان کو لڑا کر اس تماشے سے محظوظ ہوتے تھے۔ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ واجد علی شاہ کلکتہ کے قیام کے دوران میں بھی کسی حد تک اپنا یہ شغل پورا کرتے رہے۔

لیکن طیور کو لڑانے کا شوق ہر طبقے کے لوگوں کو تھا۔ اسی طرح تیتر، بوے، گلدم، لال، کبوتر اور طوطے، بیٹر اور مُرغ لڑائے جاتے تھے۔ میر نے لکھنؤ کی مرغ بازی کا ذکر یوں کیا ہے۔

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے	گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم	گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش	جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

شجاع الدولہ اور اس کے جانشینوں کو بٹیر بازی کا بھی شوق تھا۔ نصیر الدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیروں کی لڑائی دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ پرانے بٹیر بازوں میں میر بچو، میر عمدہ، خواجہ حسن، میر فدائی اور چھنگا وغیرہ بہت مشہور تھے۔

لکھنؤ کی کبوتر بازی آج بھی مشہور ہے۔ تمام نوابین، امیروں اور عوام کو اس کا شوق تھا۔ ہزاروں روپے صرف کر کے کبوتر خریدے جاتے اور بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی پرورش کی جاتی تھی۔ واجد علی شاہ نے کبوتر بازی کے شوق کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ دور دور سے اچھے کبوتر منگوا کر جمع کر رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کبوتر کا جوڑہ پچیس ہزار روپے کا خریدا تھا۔ صبح سے پہر دن چڑھے تک اور سہ پہر سے شام تک اس شغل کے علاوہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ان کے مصاحب اور ندیموں کو بھی شوق تھا۔

بچوں کے بہت سے ایسے کھیل ہیں جن کا آج بھی رواج ہے اور بعض اب مفقود ہو گئے ہیں۔ مثلاً چنڈول گدا گر بول، گانٹھ کھول بانسلی بھنبھیری میرا نام، گھور گھنڈے چوہے لنڈے۔ کالے پیلے دیو۔ شیر بکری یا باگ بکری، ایڈن، کبڈی، وزیر بادشاہ، کوڑا تیل بلی پادے وہی پھلس، چھائیں مائیں گول گھمائیں، راجہ کے گھر بیٹا ہوا اور ٹیسو رائے اور آنکھ مچولی۔ موخر الذکر کھیل آج بھی بچوں میں بہت مروج ہے۔ لڑکیوں میں گڑیا کا کھیل عام تھا۔

موسیقی

شجاع الدولہ اور بعد کے نوابوں کی قدر دانی و فیاضی نے سارے شمالی ہندوستان کے موسیقاروں اور ڈوم ڈھاریوں کو اودھ کی سرزمین میں جمع کر دیا تھا۔ امراء اور سرداران فوج جب کسی طرف کوچ کرتے تو ان کے ساتھ ارباب نشاط بھی ہوتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں فن موسیقی پر اصول النغمات الآصفیہ، کی تصنیف ہوئی۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں موسیقی پر اوس پڑ گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بڑا کامل شخص حیدری خاں تھا۔ اس کے علاوہ پیار خاں اور باسط خاں کاملین فن میں شمار ہوتے تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں اس کو پھر سے عروج حاصل ہوا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت گویوں، رنڈیوں اور ڈھاریوں کے ساتھ صرف کرتے اور خود بھی اس فن کے ماہر تھے اور انتہائی اچھا گاتے اور ناچتے تھے۔

رقص

موسیقی کے ساتھ ساتھ رقص نے بھی ایک اعلیٰ فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں نمایاں ترقی کی۔ واجد علی شاہ رقص و سرود کا دلدادہ تھا۔ سازندوں، رقاصوں اور موسیقاروں کے کئی طائفے اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ مثلاً پندرہ کلاونت مغنی ایک کمٹی والا، دو پکھاوجی، ۲۳ طبلہ نواز، ۴۶ سارنگی نواز، ۲۲ مجیرہ نواز، ۶ رقاص، ایک شعبدہ باز، دو ڈھولک نواز، ایک سُرسنگھار نواز اور ۱۹ نفر نقار خانے میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ میں ۳۲۶۱ روپے ماہانہ صرف ہوتے تھے۔ عورتوں کے علاوہ ہندو کتھک امرد، اور رہس دھاری اور دیگر مسلمان کشمیری بھانڈ اس فن میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں خوشی مہاراج ناچنے کا بڑا زبردست استاد تھا۔ نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ہلال جی، پرکاش جی اور دیالو جی مشہور ناچنے والوں میں تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں پرکاش جی کے بیٹے درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد اس میدان میں ممتاز تھے۔

یہاں کی رنڈیاں تین فرقوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ کنچنیاں، چونے والیاں اور ناگرنیاں۔ ان فرقوں نے الگ الگ اپنے گروہ قائم کر لئے تھے۔ ان کے علاوہ ناچنے والوں کا ایک اور گروہ تھا جو رہس والے کہلاتے تھے۔

آج بھی لکھنؤ ہندوستان کے سب سے اہم اور بڑے صوبے اتر پردیش کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی ۶۶۲۱۹۶ ہے یہاں ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ بستے ہیں اور لکھنؤ شہر میں آج بھی قدیم و جدید تہذیب کا ایک دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔

اقبال نمبر

جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم، اخلاق و تصوف اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :- تین روپے۔

منیجر :- نگار پاکستان - گارڈن مارکیٹ - کراچی

دریائے عشق اور بحر المحبت

تقابلی مطالعہ

(فرمان فتحپوری)

میر کی افسانوی مثنویوں میں "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" سب سے بہتر ہیں۔ پھر بھی بلحاظ افسانہ، جو کشش دریائے عشق میں ہے وہ شعلۂ عشق میں نہیں ہے، دونوں کا موضوع اگرچہ عشقیہ ہے لیکن عشق کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔ شعلۂ عشق میں مرد کو اپنے ہم جنس یعنی مرد ہی سے عشق کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے برعکس "دریائے عشق" میں عورت و مرد کی محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "دریائے عشق" کے افسانے میں وہ تصنع اور آورد کہیں نہیں ہے جو شعلۂ عشق کے غیر فطری افسانے میں جگہ جگہ نظر آتا ہے دریائے عشق میں ہیرو اور ہیروئن' دونوں کے کردار، ماحول اور اقتضائے بشری کے مطابق دکھائے گئے ہیں۔ ان سے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں اور وہی کارنامے انجام پاتے ہیں جو سچے عاشقوں کے شایان شان ہیں اور جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ لیکن "شعلۂ عشق" کا ہیرو ہیروئن کا دم بھرتے ہوئے بھی، مصلحت کوش اور دور اندیش ہے۔ اس کا عشق خام ہے اور وہ دریائے عشق کے ہیرو یا ہیروئن کی طرح "آتش نمرود" میں بے خطر کود پڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس دریائے عشق میں طالب و مطلوب دونوں نے ایک ہی جست میں قصہ تمام کردیا ہے۔

دریائے عشق میں "دایہ" کا کردار بھی زندہ کردار ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ اسی کی مکاری سے دریائے عشق کا المیہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایسا جیتا جاگتا کردار میر کی کسی اور افسانوی مثنوی میں نہیں ملتا۔ شعلۂ عشق میں "دایہ" کے کردار کا کام اس نوجوان سے لیا گیا ہے جو پرس رام کا عاشق ہے لیکن اس سے افسانے کی فضا یکسر مصنوعی اور غیر فطری ہوگئی ہے۔ جذبات کی مصوری اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی دریائے عشق کا مرتبہ شعلۂ عشق سے بلند ہے۔ اس میں شعلۂ عشق کی طرح صرف پرس رام اور اسکی بیوی کے درد و غم کا بیان نہیں ہے بلکہ ہیرو اور ہیروئن کے جذبات کی تصویر کشی کے ساتھ ان کے والدین کی ذہنی الجھن، دایہ کی مکاری محلے والوں کی انگشت نمائی اور اس دور کی سماجی و معاشرتی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس میں کردار نگاری کے ساتھ مکالموں کا بھی لطف ہے اور داستان بھی، شعلۂ عشق کے مقابلے میں طویل ہے۔ پوری داستان تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے۔ واقعات اور انداز بیان بھی شگفتہ و موثر ہے۔ مافوقِ فطرت قوتوں کا دخل ہے لیکن ایسے قرینے سے کہ انسانی ذہن اسے آسانی سے قبول کرلیتا ہے۔

نفس داستان بالاختصار یہ ہے کہ ؎

ایک جا اک جوان رعنا تھا لالہ رخسار و سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم | دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
ایک دن بیکلی سے گھبرایا | سیر کرنے کو باغ میں آیا
ناگہ اس کوچہ سے گذار ہوا | آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ | تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی | پھر نہ آئی اسے خبر اس کی
طبع نے اک جنون پیدا کیا | اشک نے رنگ خون پیدا کیا
خلق اس کی ہوئی تماشائی | پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
جوکہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ | رحم کرتے تھے آشنا یانہ
عاشق اس کو کسی کا جان گئے | سب بُرا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی | ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے | درپئے دشمنئ جان ہوئے
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا | مضطرب کدخدائے خانہ ہوا
گھر میں جا۔ بہر دفع رسوائی | بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہ تاباں | جا کے چندے رہے کہیں پنہاں
تب محافے میں اس کو کر کے سوار | ساتھ دیے ایک دایۂ غدار
پار دریا کے جلد رخصت کی | اس طرح فکر رفع تہمت کی
گھر سے باہر محافہ جو نکلا | اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپش دل سے ہو کے آگاہ | ہولیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر | کفش اس گل کی۔ اس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اکبار | اور بولی کہ او جگر افگار
حیف! تیرے نگار کی پاپوش | موج دریا سے ہو تیرے ہم آغوش
عبرت عشق ہے تو لا اس کو | چھوڑ یوں مت برہنہ پا اس کو
سن کے یہ حرفِ دایۂ مکار | دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر۔ کارِ عشق کی تہ سے | جست کی اس نے اپنی جا گہ سے
جبکہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں | کھو گیا گوہر گرامی جاں
دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد | واں سے کشتی چلی برنگ باد
قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ | آئی وہ رشکِ مہ زخود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ | ہوگیا غرق وہ فرد مایہ
مصلحت ہے کہ مجھکو لے چل گھر | ایک دو دم رہیں گے دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں؟ وہ کم مایہ
سنتے ہی یہ کہاں؟ کہاں؟ کہہ کر — گر پڑی قصدِ ترک جاں کر کر
کشش عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
خلق یکجا ہوئی کنارے پر — حشر برپا ہوئی کنارے پر
نکلے باہم دلے موئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

جو نظر اُن کو آن کرتے تھے
ایک قالب گمان کرتے تھے[1]

اب تک میر کی یہ منظوم داستان طبع زاد خیال کی جاتی تھی لیکن منظوم داستانوں کے تحقیقی و تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلا کہ اس قصے کے مخترع میر نہیں ہیں بلکہ انھوں نے دوسرے منظوم قصوں سے اس کا پلاٹ مستعار لیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے میر کی مثنوی دریائے عشق کے ایک ماخذ" کے عنوان سے لکھا ہے کہ میر کا قصہ دراصل ایک فارسی مثنوی "قضا و قدر" سے ماخوذ ہے یہ فارسی مثنوی سنہ ۱۱۱۳ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اور تقریباً سو سال بعد میر نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے[2]۔ خواجہ احمد فاروقی نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فارسی مثنوی شاعرانہ اور فنی حیثیت سے میر کی مثنوی سے کمتر درجے کی ہے۔ قصے میں میر نے عشق کی واردات اور دایہ کے قصے کا اضافہ کیا ہے اور اپنی نفس گرم کی آمیزش سے اس کی ساری فضا بدل دی ہے[3] اس سے انکار نہیں کہ میر کی مثنوی میں میر کی انفرادیت کی چھاپ ہے اور فارسی مثنوی سے بلحاظ حسن و اثر جداگانہ ہے۔ قصے کے بعض اجزا میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہے لیکن دریائے عشق کا اصل قصہ فی الواقع قضا و قدر کے قصے سے یکسر ملتا جلتا ہے اور اسے دریائے عشق کا ماخذ قرار دینا غلط نہیں ہے۔

"قضا و قدر" نامی فارسی مثنوی سے قطع نظر خود قدیم اُردو میں کئی ایسے منظوم قصے ملتے ہیں جو پلاٹ و نتیجے کے اعتبار سے دریائے عشق کے مماثل ہیں۔ ان قصوں میں چندر بدن و مہیار مصنفہ مقیمی اور طالب و موہنی مصنفہ ولہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مقیمی نے اپنا قصہ سنہ ۱۰۳۵ھ اور سنہ ۱۰۵۰ھ کے درمیان نظم کیا ہے۔ اس قصے میں بھی چندر بدن اور مہیار کے جنازے اس طرح ہم آغوش دکھائے گئے ہیں کہ کوشش کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکے اور آخر کار دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ ولہ کی منظوم داستان سنہ ۱۱۷۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بھی دریائے عشق سے بہت ملتا جلتا ہے فرق یہ ہے کہ دریائے عشق میں طالب و مطلوب کی لاشیں دریا سے اور طالب و موہنی کی لاشیں کنوئیں سے نکالی گئیں، لاشوں کا انجام دونوں میں یکساں ہے۔ جس وقت طالب و موہنی کی لاشیں باہر آئیں تو لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عاشق و معشوق کی لاشیں باہم پیوست ہیں۔ کوشش کی گئی کہ علیحدہ کیا جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ حاکم وقت کو اطلاع ہوئی اور نماز جنازہ کے بعد ایک ہی قبر میں وہ دونوں دفن کئے گئے[4]

---

1. کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی مطبع نول کشور لکھنؤ سنہ ۱۹۴۰ء ص ۹۰۰ تا ۹۱۰
2. رسالہ اردو اپریل سنہ ۱۹۵۱ء
3. میر تقی میر حیات و شاعری ص ۴۳۹
4. یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۳

دریائے عشق کے قصے کو بعد میں مصحفی نے نظم کیا اور بحر المحبت[1] نام رکھا خود لکھتے ہیں۔

مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام　　　رکھا بحر المحبت اس کا نام

بحر المحبت کی تاریخ تصنیف کا سراغ صحیح طور پر اب تک نہیں لگ سکا۔ لیکن اب جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی زندگی ہی میں دریائے عشق مشہور ہو گئی تھی اور مصحفی نے میر کی زندگی ہی میں اس قصہ کو دوبارہ نظم کا جامہ پہنایا ہے[2] ——————— .اس قصے کو دوبارہ نظم کرنے میں کس قسم کی ندرت کا اظہار انھوں نے کیا ہے اور کن کن مقامات پر حسن کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

آغاز داستان سے پہلے میر نے ۳۲ اشعار عشق اور اس کی کار فرمائیوں کے متعلق اس طور پر کہے ہیں۔

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　　ہر جگہ اس کی ایک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا　　　کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا　　　کہیں سر میں جنوں ہو کے رہا
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا　　　کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ　　　کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خار دلِ غریباں ہے　　　انتظار بلانصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہل ماتم کا　　　کہیں نوحہ ہے جانِ پُر غم کا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے　　　ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہے
جس کو ہو اس کی الذات نصیب　　　ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے　　　کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

میر کی اکثر مثنویوں کے ابتدا میں عشق کے متعلق اس قسم کے اشعار ملتے ہیں، بلکہ عشق اور اس کی کیفیات و لوازم و اثرات کے متعلق جن تفصیلات و نکات کا ذکر ان کی مثنویوں میں ملتا ہے وہ ان کی غزلوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ بات یہ ہے کہ میر طبعاً عاشق مزاج تھے۔ اور انھیں ابتدا میں جو تعلیم ملی تھی وہ عشق و تصوف ہی کی تھی۔ میر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ جب ان کے والد مجاہدے اور استغراق سے فرصت پاتے۔ تو سمجھاتے کہ "عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا۔ تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق زندگانی وبال جان ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے عشق ہی بگاڑتا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوز عشق ہے — پانی رفتار عشق ہے خاک قرار عشق ہے۔ ہوا اضطرا

---

1. دیباچہ طبع دوم بحر المحبت مرتبہ عبدالماجد دریابادی ص۳
2. بحر المحبت کی تاریخ تصنیف کا سراغ نہیں ملتا لیکن جو دو نسخے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان پر کتابت کا سال سنہ ۱۲۴۱ھ اور سنہ ۱۲۳۵ھ درج ہے۔ پہلا نسخہ مولوی عبدالماجد دریابادی اور دوسرا شاکر حسین نکہت سہسوانی کی ملک ہے۔ دوسرے نسخے کی سن کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصحفی نے میر کی حیات میں بحر المحبت لکھا تھا۔ سب سے پہلے رسالہ اردو اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی

عشق ہے۔ موت عشق کی ہستی ہے۔ حیات عشق کی ہوشیاری ہے۔ رات عشق کا خواب ہے اور دن عشق کی بیداری ہے[1]
اس تعلیم و تربیت کا اثر جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ میر نے عشق اختیار کیا اور اس طرح اختیار کیا کہ عشق ان کا جزو حیات بن گیا۔ وہ صرف نظری طور پر عشق کے دلدادہ نہ تھے بلکہ اسے سرچشمہ حیات جانتے تھے۔ دل پرخوں کی ایک گلابی سے عمر بھر شرابی رہنے کا دعویٰ یونہی نہیں ہے۔ ان کی ساری زندگی عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی تھی اور سچ پوچھو تو اپنی اس عشقیہ زندگی کو ڈھکائے چھپائے رکھنے کے لئے انھوں نے شعر گوئی کی آڑ لی تھی۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اک آفت زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

میر خود اپنی عشقیہ زندگی کے متعلق ذکر میر میں فرماتے ہیں۔

"شعری خواندم۔ عاشقانہ می زیستم۔ تنہا می گریستم۔ عشق باخوش اندلے می کنم"

یہ بھی مسلم ہے کہ میر کو عشق میں ناکامی ہوئی اور اس ناکامی کا اثر ان کی شخصیت پر اتنا گہرا ہے کہ وہ ہزار پردوں میں بھی صاف جھلک جاتا ہے۔ اس برتی ہوئی محبت ہی کا فیضان کہ میر جب عشق۔ اور عشق کے لوازم و اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے اشعار سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں جذبہ کی صداقت اور شدت کے اعتبار سے میر کی عشقیہ شاعری میں جو اثر آفرینی ہمہ گیری اور گھلاوٹ نظر آتی ہے۔ وہ ابھی کسی اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ نہ صرف غزل بلکہ ان کی مثنویوں کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ عشق کا جیسا سچا شدید اور اثر انگیز بیان میر کے یہاں ملتا ہے۔ وہ مجموعی حیثیت سے اردو کے چند شعرا کے سوا کسی مثنوی نگار کے یہاں موجود نہیں ہے۔ ہر مثنوی کے آغاز میں میر صاحب نے پہلے عشق کی ماہیت و کیفیت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر عشق کی صفات و کرامات کے اظہار کے لئے کوئی حکایت نظم کی ہے۔ دریائے عشق کا بھی یہی انداز ہے اور قصے کے آغاز سے پہلے انھوں نے عشق کے متعلق متعدد شعر کہے ہیں۔ یہ اشعار اگرچہ کہانی سے غیر متعلق ہیں لیکن اوپر جو اشعار درج کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار دنیائے شاعری میں مرنے والے نہیں ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی صاحب بحر المحبت اور دریائے عشق کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میر صاحب نے شروع کے ۳۲ شعروں میں عشق کے عام کارنامے بیان کئے ہیں مصحفی کے ہاں بھی تمہید کے ۱۲ اشعار اسی رنگ کے ہیں[2]"

خدا جانے عبد الماجد صاحب نے یہ بات کس بنا پر لکھی ہے۔ بحر المحبت میں ۱۲ اشعار کیا ایک شعر بھی عشق یا عشق کے کارناموں کے متعلق نہیں ہے۔ خود ماجد صاحب کی مرتبہ بحر المحبت میں جو ۱۲ اشعار آغاز حکایت سے قبل ملتے ہیں وہ عشق کے موضوع پر نہیں بلکہ دعا اور تعلی کے انداز کے ہیں۔ میر کے ۳۲ شعروں کا رنگ دیکھ چکے ہیں اب ذرا بحر المحبت کے ان ۱۲ اشعار کا رنگ دیکھئے ؎

لبِ زخمِ قلم ذرا وا ہو تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو
ساتھ کاغذ کے عشق بازی کر یعنی کچھ داستاں طرازی کر
کسی خستہ جگر کے حال کو لکھ کسی سرو رواں کی چال کو لکھ

---

[1] ترجمہ ذکر میر۔
[2] بحر المحبت ص ۲۶ طبع ثانی کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی۔

ناشکیبی کسی کی دکھلا دے — دل فریبی کسی کی لکھوا دے
کہیں بے حاک آہ کر تحریر — دے بنا زلف کی کہیں زنجیر
قصہ عشق لیلیٰ و مجنوں — گرچہ کچھ اس قدر نہ تھا مضموں
تیری طراحیوں سے دور کھنچا — کئی اہلِ سخن نے اس کو لکھا
مبتذل عشق کا نہ ہو مضمون — عشق موزوں کو پھر بھی کر موزوں
گرچہ ہے ملک میر نادرہ کار — تو بھی قدرت کا اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھر — دے ذرا اور بھی تو حسن ملا
سطح کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر — جس سے حیران رہیں صغیر و کبیر
رمز شق القمر جتا دے تو — معجزہ اپنا تک دکھا دے تو

ظاہر ہے کہ ان اشعار کی نوعیت و کیفیت میرؔ کے ابتدائی اشعار سے بالکل مختلف ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ دریائے عشق کے قصے کو مصحفی نے دوبارہ نظم کر کے ان کے حسن میں کس قسم کا اضافہ کیا ہے اور کیا مصحفی کا یہ دعوئے درست ہے کہ انھوں نے میر کے رنگ کو اپنی قدرت بیان سے اور نکھار دیا ہے۔ داستان کے آغاز میں میر صاحب ایک عاشق مزاج نوجوان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں۔

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
تھا طرحدار آپ بھی نیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کوئی وہ خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
سر میں تھا شوق ۔ ذوق دل میں تھا — عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا

مصحفی اس لالہ رخسار نوجوان کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ایک جا اک جوانِ خوش ظاہر — تھا نپٹ فن عشق سے ماہر
دل پہ صدمے بڑے اٹھائے تھے — داغ پر داغ اس نے کھائے تھے
گر کہیں روئے خوش نظر آتا — نوک مژگاں تلک جگر آتا،
ہو کے ممنونِ ناشکیبیٔ شوق — تھا نظر باز دل فریبیٔ شوق
تپش دل کو راہ تھی اس سے — چشم حیرت نگاہ تھی اس سے

ان اشعار سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصحفی نے میرؔ کے شعر پر شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آغاز داستان میں مصحفی کو میر کے رنگ کو گہرا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ بے رنگ تقلید کا اثر جھلک گیا ہے۔ میرؔ کے پہلے شعر میں جو تازگی، برجستگی اور لطافت ہے وہ مصحفی کے یہاں مفقود ہے۔ میرؔ نے کہانی کے ہیرو کو "جوان رعنا، لالہ رخسار اور سرو بالا" جس بے ساختگی سے کہہ دیا ہے۔ وہ مصحفی سے نہ بن سکا۔ "جوان رعنا" کی جگہ "جوان خوش ظاہر"، "فن عشق کا ماہر" کا خطاب دیا ہے۔ لیکن ان ترکیبوں میں تصنع اور آورد کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان میں وہ زور، حسن اور اثر نہیں ہے۔

جو میر کی ترکیبوں میں پایا جاتا ہے۔

عاشق ایک دن سیر و تفریح کے لئے نکلتا ہے اور اس کی آنکھ غرفہ سے جھانکنے والی ایک مہ پارہ پر پڑتی ہے۔ نظر ملتے ہی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور صبر و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ مصحفی اولین ملاقات و نظارگی کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔

دل تھا اُس جو کا عشق آمادہ ہو گیا اک جگہ وہ دلدادہ
یعنی اک نازنین گل رخسار ہوئی غرفہ میں اس سے آدو چار
اس کی آنکھ اُس پہ، اسکی اُس پہ پڑی یکدگر جب بہم نگاہ لڑی
دل نے جب لگ کے آہ پیدا کی لب۔ خامُش نے آہ پیدا کی
آنکھ بے اختیار بھر آئیں پلکیں ندیاں سی کچھ نظر آئیں
اشک آ۔ حائل نظارہ ہوئے جگر و دل ہزار پارہ ہوئے

میر تقی میر نے عاشق و معشوق کی نظر بازیوں اور ان کے اثرات کا ذکر اس طور پر کیا ہے۔

ناگہ اک کوچے سے گذار رہوا آفتِ تازہ سے دو چار ہوا
ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی پھر نہ آئی اسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کم ادائی کی تاب و طاقت نے بیوفائی کی

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عشق کا پہلا تیر کھانے کے بعد ہیرو اور ہیروئن کی جو حالت ہوتی ہے اس کی مرقع نگاری میں بھی مصحفی کسی جدت و ندرت سے کام نہیں لے سکے بلکہ میر کے مقابلے میں ان کا بیان پھیکا اور بے جان ہے۔ میر چونکہ خود کوچہ عشق کے نشیب و فراز سے آشنا تھے اس لئے ان کا بیان اس باب میں زیادہ قرین قیاس ہے، شدید اور اثر انگیز ہے مصحفی کے پہلے دونوں شعر بھرتی کے ہیں۔ ان میں برجستگی اور آمد کا پتہ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سرسری طور پر نثری خیالات کو نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ان سے ہیرو کی شخصیت، اس کے کردار اور اس کی عاشقانہ افتاد طبع پر روشنی نہیں پڑتی۔ مصحفی کے اشعار میں جس عاشق مزاج ہیرو کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں حوصلہ مندی اور اُلوالعزمی کے بجائے مجبولیت و انفعالیت نظر آتی ہے۔ پھر موقع محل کی مناسبت کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہیرو اور ہیروئن پہلے سے مقررہ شدہ جگہ پہ پہنچ کر نظر بازی میں مشغول ہو گئے۔ اس کے برعکس میر نے اسے حادثہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور روئداد کو ہر طرح برمحل اور قابل یقین بنا دیا ہے۔ میر کے یہ دو شعر:-

ناگہ اک کوچہ سے گذار ہوا آفتِ تازہ سے دو چار ہوا
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

آغاز داستان کو متحرک و جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ "ناگہ، آفت تازہ، کے الفاظ سے انھوں نے واقعہ کو فطری بنا دیا ہے۔ دوسرے شعر کی برجستگی اور سلاست نے ہیرو کی عاشقانہ شخصیت کو جس طرح نمایاں اور دلکش بنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں مصحفی

کو کامیابی نہیں ہوئی۔

ہیروئن دامن جھاڑ کر یکبارگی اٹھ جاتی ہے۔ ہیرو اُسے غائب پاکر اور مضمحل و مضطرب ہو جاتا ہے۔ میر نے اس موقع کی تصویر یوں پیش کی ہے ؎

جھاڑ دامن وہ اپنا مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ
وہ گئی اس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز — رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پہنچے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا — اشک نے رنگ خوں کیا پیدا

میر کا یہ بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن اثر سے خالی نہیں ہے۔ مصحفی نے ہیرو کی بے قراری قدرے وضاحت سے نظم کی ہے اور انکا بیان اس موقع پر میر سے بہتر نہ سہی لیکن میر سے کمتر درجے کا نہیں ہے۔ پہلا شعر اگرچہ بھرتی کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باقی تمام شعار میں عاشق کے اضطراب کو سلیقے سے نظم کر گئے ہیں۔

درِ غرفہ میں جو تھی تصویر — صاف غائب ہوئی وہ بدر منیر
جوں ہی نظروں سے چھپ گیا وہ ماہ — نظر آیا جوان کو روز سیاہ
جان مضطر ہو تن سے جانے لگی — بیخودی میں غشی سی آنے لگی
پاس ناموس کا اٹھا کھٹکا — سر کو اس آستاں پہ دے پٹکا
شیشۂ دل کو چور چور کیا — پیرہن چاک کر کے دُور کیا
گئی سو بار سوئے غرفہ نگاہ — پر نہ آئی نظر وہ غیرت ماہ
تپش دل نے بات ہی کھودی — بیقراری نے گھات ہی کھودی
جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ — لوہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ
سوزشِ دل دوچند ہونے لگی — سر آتش بلند ہونے لگی

ہیرو کی اس شوریدہ سری کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبت کا راز فاش ہو گیا اور عشق و محبت کا یہ افسانہ زبان زد خلائق ہونے لگا۔ ہیروئن کے والدین اور قرابت داروں کو جب اس معاشقے کی خبر ہوئی تو وہ بڑے خفیف و شرمندہ ہوئے اور ناموس خاندان کے بچانے کے لئے اس افسانے پر ہر طرح پردہ ڈالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ پہلے تو عاشق کو ہر طرح پریشان کیا گیا۔ اس کے پیچھے بچوں کا ایک گروہ لگا دیا گیا جو ہر وقت اس پر سنگ باری کرتا اور چھیڑتا رہتا۔ عاشق پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا وہ سچا عاشق ہے اور مصائب و شدائد سے بے خبر رہ کر محبوب کا دم بھرتا رہتا ہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تو لڑکی کے بعض رشتہ دار عاشق کو قتل کرا دینے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ایک طرف اس کے پھندے سے نجات پا جائے دوسری طرف اہل خاندان طعن و تشنیع سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ میر کے یہاں عاشق کے خلاف لڑکی والوں کی طرف سے اس قسم کے اقدامات کا ذکر نہیں ہے۔ میر نے لڑکی کے والدین اور اہل خاندان کو اس واقعہ سے متاثر و متفکر دکھایا ہے۔ لڑکی کو بدنامی سے بچانے کی تدابیر پر بھی غور کیا ہے۔ لیکن عاشق کو زد و کوب کرنے اور قتل کرا دینے کی کوششیں نہیں کیں۔ مصحفی نے اُن

واقعات کا اصل پلاٹ میں اضافہ کیا ہے اور شاید داستان کو زیادہ موثر، خاص طور پر ہیروئن کی والدین کی پریشانی کو زیادہ فطری اور شدید بنا کر پیش کرنے کی غرض سے اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں ؎

صاحبِ خانہ تھا زبس (کہ) غیور — دیکھ کر اس گلی میں یہ شر و شور
مشورت ہر کسی سے کرنے لگا — مارے غیرت کے سخت مرنے لگا
چشم گاہے کہے مار ہی ڈال — جوں بنے اس بلا کو سر سے ٹال
لطف گاہے کہ تساہل کر — دیکھ ہوتا ہے کیا تامل کر
آخر کار تھے جو محرم کار — ایک دن ان کو جمع کر اک بار
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجیے — کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجیے
کیونکہ سر سے ٹلے یہ رسوائی — تب انھوں نے یہ بات ٹھہرائی
یعنی اوباش کوچہ و بازار — کچھ نہ کچھ اس کو دیویں آزار
جب یہ ٹھہری تو کودکان شریر — ساتھ لے کر کے اپنی جمع کثیر
یک بیک اس جواں پر ڈھلئے — لڑکے کیا آئے اک بلا لائے
سنگ ساری کسی نے اس پر کی — خاک باری کسی نے اس پر کی
کوئی تلوار سے ڈرانے لگا — اس پہ برچھی کوئی اٹھانے لگا
ہاتھ کھینچا کسی نے اس کا بزور — کوئی غصّے سے آیا بر سر شور

ان واقعات کے اضافے سے والدین کی ذہنی الجھن کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی مصحفی نے عاشق سے نجات پانے کے لئے لڑکی کے والدین کی طرف سے جن تدابیر کو عملی جامہ پہنایا ہے، وہ معاشرتی ماحول کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے موقع پر والدین ذہنی الجھن میں مبتلا ہوئے ہونگے انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، عزیزوں اور دوستوں نے مشورے بھی مختلف قسم کے دئے ہوں گے۔ لیکن عاشق کو برسرعام قتل کرا دینے، اس کے پیچھے شرارت پسندوں کا گروہ لگا دینے اور طرح طرح کے آزار پہنچانے کے واقعات کچھ زیادہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتے۔ داستان میں جس بنا پر لڑکی کو والدین سے جدا کیا جا رہا ہے وہ بڑا نازک موقع ہے۔ ہمارے معاشرے میں جب کسی لڑکی کے متعلق اس قسم کی خبر محلے میں اُڑتی ہے تو ذہنی کوفت اور الجھن کے باوجود والدین بڑی خاموشی اور رازداری سے رسوائی و بدنامی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور رازداری سے بھی اکثر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ انھیں تمام واقعات کا علم ہوتا ہے پھر بھی وہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ سانپ مارنے سے زیادہ لاٹھی بچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لئے عاشق کی کھلم کھلا مخالفت اور اس کو سرِراہ اذیت پہنچانے کی کوشش والدین کی نفسیات کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خاندان کے بعض افراد نے اس قسم کی رائے ضرور دی ہوگی اور عاشق کا برا بھی چاہا ہوگا لیکن لڑکی کے والدین نے عاشق کو بالاعلان آزار پہنچا کر اپنی رسوائی و بدنامی کو طشت از بام کرنا پسند نہ کیا ہوگا۔ اس لئے مصحفی کی تفصیلات اس سلسلے میں حسنِ داستان نہیں بلکہ داستان کا عیب بن گئی ہیں۔ میر نے اس قسم کی بعید از قیاس باتوں کو داستان میں جگہ نہیں اس لئے ان کا بیان مصحفی کے مقابلہ میں زیادہ فطری اور اثرانگیز ہے۔ اس موقع پر تفصیل کے بجائے اجمال اور

افشائے راز سے کہیں زیادہ اخفائے راز کی ضرورت تھی۔ میر نے اس ضرورت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے لیکن مصحفی نے میر کے بے رنگ خاکوں کا رنگ کچھ اور گہرا کرنے کی کوشش میں واقعات کی بعض تصویریں بگاڑ دی ہیں۔

میر نے بھی بعض واقعات کی تصویر کشی میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے اور تصویر کے ضروری خد و خال بھی نمایاں نہیں کئے ہیں۔ مثلاً میر نے اپنی داستان میں لڑکی کو جس خاموش پس منظر میں والدین سے جدا کر کے دریا پار ایک قریبی عزیز کے یہاں بھیجا ہے وہ مشرق کی معاشرت کے مطابق نہیں ہے۔ داستان میں جس لڑکی کا ذکر ہے وہ متوسط درجے کے شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ پردے میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی ہے۔ اس کو بالغ ہو جانے کے بعد بھی کسی بڑھی بوڑھی کا ساتھ لئے بغیر کسی قریبی عزیز و بے تکلف دوستوں کے یہاں بھی جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ لڑکی خواہ کیسی ہی باشعور اور تیز طرار کیوں نہ ہو والدین بالعموم جوان لڑکی کو خود اپنے گھر میں تنہا چھوڑنا یا دوسروں کے یہاں بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔ ہماری معاشرت کا عملی پہلو بڑی حد تک آج بھی یہی ہے اور کنواری لڑکیاں اپنی ماں کا ساتھ لئے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ عام محفلوں یا تقریبوں میں بے تکلف آنے جانے کی انھیں اجازت نہیں ہوتی۔ وہ ضروری تقریبات میں اپنے قریبی عزیزوں کے یہاں جاتی ہیں لیکن بلا ضرورت قیام نہیں کرتیں۔ اگر کوئی لڑکی اس کے خلاف کرتی ہے۔ یا اس کے والدین ان معاملات میں احتیاط نہیں برتتے تو چاروں طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ لڑکی اور لڑکی کے والدین دونوں محلے اور خاندان میں طعن و تشنیع کا مرکز بنتے ہیں۔ ایسی حالت میں والدین کا لڑکی کو اپنے ایک عزیز کے یہاں راتوں رات دایہ کے ساتھ بھیج دینا کوئی آسان مسئلہ نہ تھا۔ (باقی)

نگار پاکستان کا سالنامہ

نیاز نمبر ۶۳ء

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصہ لیا ہے اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو، مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ صفحات ۳۲۲ قیمت آٹھ روپے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

پاسِ عہد

(انقلاب حکومت عثمانی کا ایک تاریخی رومان)

نیاز فتحپوری

قاہرہ کے ایک نہایت آباد محلہ میں ایک غیر آباد گھر بھی تھا۔ اس مکان کی وحشت و ویرانی کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور تھیں۔ محلہ کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ یہاں راتوں کو جنات آتے ہیں اور جب سارا شہر سو جاتا ہے تو یہ اس مکان میں ہنگامہ مچاتے پھرتے ہیں۔

یہ مکان کسی وقت بڑا محل رہا ہوگا لیکن اب بالکل کھنڈر تھا اور اس کی دیواریں اور اونچی اونچی چھتیں، چمگادڑوں اور ابابیلوں کا مسکن تھیں۔ جن کی چیخ اور پھڑپھڑاہٹ سے رات کے سناٹے میں یہ مکان اور زیادہ بھیانک ہو جاتا تھا لیکن اہل محلہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک شام انھوں نے دیکھا کہ ایک نامعلوم شخص اس مکان میں آگیا ہے۔

یہ ایک نہایت ضعیف شخص تھا۔ کمر ٹیڑھی، بینائی کمزور اور صورت مکروہ۔ شام کو یہ مکان کے اندر داخل ہوا اس حال میں کہ ایک ہاتھ سے وہ لکڑی کا سہارا لیتا جاتا تھا اور دوسرا ہاتھ ایک حبشی کے ہاتھ میں تھا۔ لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا اور اسے جادوگر سمجھ کر خاموش ہو رہے یہ شخص صرف جمعہ کے دن نماز پڑھنے باہر نکلتا تھا اور پھر ایک ہفتہ کے لئے اندر بند ہو جاتا تھا۔ لوگ اسے آتے جاتے دیکھتے تھے لیکن پاس نہ جاتے تھے اور بالکل الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔

اسی کھنڈر کے پاس ایک عظیم الشان محل تھا جس کے مالک کا نام لطیف پاشا تھا یہ معہ اپنی بیوی سیدہ نادر، اور بیٹی فاطمہ کے یہاں رہتا تھا۔ فاطمہ کی عمر انیس سال کی تھی اور بہت کمسنی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ لطیف پاشا نے اس کے بعد کئی شادیاں کیں اور ساری دولت عیش رانیوں میں کھو دی۔ اس وقت اس کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن اس کی بیوی سیدہ نادر ابھی تک جوانی کے حدود سے باہر نہ نکلی تھی اور جو کچھ لطیف پاشا کے پاس باقی رہ گیا تھا وہ اس کی زیبائش و آرائش میں صرف ہو رہا تھا۔

فاطمہ کے سر سے چونکہ ماں کا سایہ بہت کمسنی میں اٹھ گیا تھا اور لطیف پاشا اپنی رنگ رلیوں میں بیٹی کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا، اس لئے اس کا نشو و نما اچھی طرح نہ ہو سکا اور اس کے چہرہ پر ایک مستقل کیفیت سوگ کی سی قائم ہو گئی۔ اس کی عمر ۱۹ سال کی ہو چکی تھی، لیکن سوائے قدرتی خد و خال کی خوبصورتی کے ولولۂ شباب سے پیدا ہونے والے حسن و جمال کی جھلک اس میں بہت کم پائی جاتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں۔ کھلی ہوئی پیشانی اور صبیح کتابی چہرہ سے ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی تھی، لیکن جوانی

کی مسرتوں کا کہیں پتہ رہتا۔ وہ ہر وقت کسی فکر میں مبتلا نظر آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہلکے قسم کے مقناطیسی خواب میں مصروف ہے۔

وہ اپنے باپ کی نہایت اطاعت مند اور اپنی سوتیلی ماں کی نہایت خاموش بیٹی تھی اور اس نے کبھی اس بات کا موقعہ نہیں دیا کہ سیدہ نادر لطیف پاشا سے کوئی شکایت اس کی کر سکے۔ قرض پر قرض بڑھ رہا تھا اور لطیف پاشا کی ایک ایک چیز سیدہ نادر کی آسائش و زیبائش پر قربان ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ مکان بھی رہن ہو گیا اور رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ مکان نیلام ہو گیا اور لطیف پاشا کو اس کے خالی کرنے کا نوٹس مل گیا۔

یقیناً لطیف پاشا اور سیدہ نادر کیلئے یہ بڑا سخت وقت تھا۔ کیونکہ اب سر چھپانے کی جگہ بھی ان سے چھینی جا رہی تھی اور دنیا میں کہیں ان کو دوسرا ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ فاطمہ کی دردمندیاں ان سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ اب ایک طرف تو وہ اپنے باپ کی مصیبتوں کا خیال کر کر کے پریشان ہو رہی تھی اور دوسری طرف وہ اس مکان سے جدا ہو رہی تھی، جہاں اس کی مری ہوئی ماں کی بہت سی یادگاریں اس کا دل بہلایا کرتی تھیں۔

نوٹس ملنے کے دوسرے دن صبح کو لطیف پاشا نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ گھر سے نکلنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسی کھنڈر والے پڑوسی کا حبشی خادم آیا اور کہا کہ میرے مالک نے ایک خاص پیغام دے کر بھیجا ہے۔

لطیف پاشا نے پوچھا، تمہارا مالک کون ہے؟" اس نے جواب دیا "میں آپ کے نئے پڑوسی مختار آفندی کا خادم ہوں اور میرا نام سعید ہے!"

لطیف پاشا نے کہا کہ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمہارا مالک جو خود ساری دنیا سے الگ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ایک ایسے شخص کے پاس کیا پیام بھیج سکتا ہے جو خود دو گھنٹہ کا مہمان ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی آئندہ زندگی تمہارے مالک کی جائے قیام سے کتنی دور، کس طرح بسر ہوگی۔"

سعید :۔ "یہ درست ہے۔ لیکن میرے آقا نے اسی مکان کے متعلق ایک پیام دے کر بھیجا ہے۔"

لطیف پاشا" میں سمجھ گیا۔ یہ مکان غالباً اسی نے خریدا ہے اور تم یہ کہنے آئے ہو گے کہ میں جلد سے جلد اسے خالی کر دوں، تو، تم اپنے مالک سے جا کر کہہ دو کہ ہم مکان چھوڑ رہے ہیں اور شام کو وہ آزادی کے ساتھ یہاں آسکتا ہے۔"

سعید :۔ "نہیں، میں یہ کہنے نہیں آیا، بلکہ یہ پیام لے کر آیا ہوں کہ آپ بدستور اس مکان میں قیام رکھیں اور کسی اور جگہ منتقل ہونے کی زحمت گوارا نہ کریں۔"

لطیف پاشا یہ سن کر حیران رہ گیا اور بولا کہ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں بالکل نہیں سمجھا۔"

سعید :۔ "میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ واقعی یہ مکان میرے آقا نے خرید لیا ہے، لیکن وہ نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ بلکہ وہ پانچ ہزار گنی کا ہدیہ بھی آپ کی ضرورتوں کے لئے پیش کرنا چاہتا ہے۔"

لطیف پاشا :۔ "کیا تو پاگل ہو گیا ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے۔"

سعید :۔ "نہیں میں پاگل نہیں ہوں، بلکہ ایک واقعی معاملہ کی صورت سے یہ پیغام لے کر آیا ہوں۔"

لطیف پاشا :۔ "معاملہ؟ معاملہ کیسا؟"

سعید :- "وہ یہ کہ میرا آقا۔ اس کے عوض میں آپ کی بیٹی فاطمہ کو پیغام نکاح دینا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر لطیف پاشا زور سے ہنسا اور بولا کہ "کیا تیرا آقا دیوانہ ہے۔ کیا اسے یقین ہے کہ میں ایک بدصورت بڈھے سے اپنی بیٹی کو بیاہ دوں گا۔ مجھے فقر و فاقہ کی مصیبتیں گوارا ہو سکتی ہیں، لیکن یہ رشتہ گوارا نہیں۔"

سعید نے کہا کہ "آپ پھر اس پر غور فرمائیے" یہ سن کر پاشا چلا اٹھا اور نہایت سخت و سست الفاظ منھ سے نکالنے لگا۔

اس شور کو سن کر سیدہ نادرہ اور فاطمہ بھی وہاں پہنچ گئیں اور پاشا نے سارا حال انھیں سنایا۔ سیدہ نادر دل سے تو چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ کیونکہ اس طرح فاطمہ بھی گھر سے چلی جائے گی اور اس کی عیش رانیوں کے لئے کافی دولت ہاتھ آئے گی، لیکن کچھ بولی نہیں۔ فاطمہ البتہ اٹھی اور اپنے باپ سے کہا کہ "آپ اس پیغام کو قبول کر لیجئے۔ کیونکہ میں آپ کی تکلیف و مصیبت کو نہیں دیکھ سکتی۔ میری ایک ذات کی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی اگر اس سے کسی خاندان کی تباہیاں دور ہو سکتی ہوں"

یہ سن کر لطیف پاشا نے بہت کوشش کی کہ فاطمہ کو اس ارادے سے باز رکھے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور آخر کار دوسرے ہی دن فاطمہ کی شادی ہو گئی۔

فاطمہ جب شوہر کے گھر میں داخل ہوئی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کھنڈر کے عفریت پر قربانی چڑھ چکی تھی اور ڈر رہی تھی کہ معلوم نہیں وہ عفریت اسے کیا کیا اذیتیں پہنچائے۔

جب فاطمہ یہاں پہنچی تو اس کے شوہر مختار آفندی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھنڈر کی سیر کرانے لے چلا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہاں کثافت کا ڈھیر ہوگا۔ چمگادڑوں اور ابابیلوں نے ہر طرف گندگی پھیلا رکھی ہو گی اور ہر طرف عفونت ہی عفونت نظر آئے گی، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ مکان جو باہر سے اس قدر ویران نظر آتا ہے اندر سے ایک آراستہ محل بنا ہوا ہے۔ اسکے متعدد کمرے، متعدد برآمدے، شہ نشین۔ حجرے۔ انتہائی نفاست کے ساتھ آراستہ تھے اور پھولوں کی خوشبو سے معطر!

صحن میں روشیں، پھولوں کی کیاریاں، سنگ مرمر کے فوارے، ریشمی پردے، قیمتی تصویریں، ایرانی قالینوں کا فرش نہایت عمدہ قسم کا فرنیچر، فانوسوں کی روشنی، الغرض ہر وہ چیز جو ایک خوش ذوق دولتمند کے مکان میں ہونا چاہئے یہاں موجود تھی۔

مختار آفندی، فاطمہ کو صحن کے درمیانی فوارے کے پاس لے گیا اور وہاں ایک نرم مسہری پر بٹھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا کہ "آج تک میں اس مکان کا مالک تھا۔ لیکن اس وقت سے تم نہ صرف اس مکان بلکہ ہر اس چیز کی مالک ہو جو تمھیں یہاں نظر آتی ہے۔ اس وقت تک تمھارا ماضی جس طرح بھی بسر ہوا ہو، مجھے اس سے بحث نہیں، نہ اس کے ذکر کی ضرورت، لیکن تمھارے حال و مستقبل کے متعلق مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ وہ صرف تمھارے ہاتھ میں ہے اور مجھے دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، دنیا کی ہر وہ راحت جو دولت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ تمھارا حق ہے اور اس زندگی کی ہر وہ مسرت جسے تم حاصل کرنا چاہتی ہو میری طرف سے اس کی اجازت ہے۔"

فاطمہ، اپنے بوڑھے شوہر کی ان پرشباب باتوں کو سن کر حیران تھی۔ وہ تعجب کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی گرمی، اس کے لب و لہجہ کا جوش اس کی آواز کی مردانہ کھنک، سب اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس کا شوہر شباب کی تمام کیفیات کا حامل ہے لیکن جس وقت وہ اس کی موٹی بھدی ناک، لمبی داڑھی، مکروہ صورت اور ضعیف خط و خال کو دیکھتی تو پھر مضمحل ہو کر نگاہیں نیچی کر لیتی اور دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی۔

باتوں ہی باتوں میں نصف شب گزر گئی اور مختار آفندی، فاطمہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر اس سے رخصت ہو گیا۔

فاطمہ ساری رات جاگتی رہی، تنہا اپنے کمرے میں پڑی سوچتی رہی کہ یہ کیا معمہ ہے۔ یہ کیسا انسان ہے اور اس کے ظاہر و باطن میں کیوں اتنا فرق نظر آتا ہے۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی بھی تو وہ اسی قسم کے مبہم خواب دیکھتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو چمن کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور خوشبو کی لپٹیں کھڑکیوں سے آرہی تھیں۔

وہ ابھی پوری طرح بیدار بھی نہ ہوئی تھی کہ مختار آفندی آیا اور اس نے فاطمہ سے کہا کہ "میں ایک ضروری کام سے باہر سفر پر جا رہا ہوں اور غالباً دو مہینے تک واپس نہ آسکوں گا۔ میں اپنے پیچھے اپنے خادم سعید کو چھوڑے جاتا ہوں جو ہر طرح تمہاری آسائش کی فکر رکھے گا اور اپنے لطائف سے تمہارا جی بہلاتا رہے گا۔"

فاطمہ نے یہ سن کر کہا کہ "کیا سعید اس تکلیف کا بدل ہو سکتا ہے جو آپ کے نہ ہونے سے مجھے پہنچے گی" اور یہ پہلا جملہ تھا جو شادی کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔

مختار نے کہا کہ "نہیں، میں نے اپنے بھتیجے شکیب کو بھی اطلاع دیدی ہے۔ وہ یہاں آئے گا اور تمہاری تنہائی کی تکلیف کو پوری طرح دور کرے گا۔ یہ نہایت نیک و سنجیدہ نوجوان ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کی موجودگی میں تم مجھے کم یاد کرو گی۔"

فاطمہ اس کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ مختار خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

تین دن گزر گئے اور سعید نے فاطمہ کا دل بہلانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔ اسے عمدہ عمدہ کہانیاں سناتا، اچھے اچھے لطیفوں سے دل خوش کرتا۔ یہاں تک کہ فاطمہ اپنی تنہائی کی تکلیف کو بھول چلی۔ چوتھے دن سعید نے آکر خبر سنائی کہ شکیب آگئے ہیں اور ان کا سلام فاطمہ کو پہنچایا۔

فاطمہ سعید کے لطائف و ظرائف میں بالکل بھول گئی تھی کہ اس کے شوہر نے شکیب کا ذکر کیا تھا اور وہ آنے والا تھا۔ اس نے سلام کا جواب کہلا بھیجا اور سعید کو حکم دیا کہ شکیب کی راحت و آسائش کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ شکیب کو ایک تنہا کمرہ میں ٹھہرا دیا گیا اور فاطمہ پھر سعید کی باتوں سے اپنا دل بہلانے لگی۔

ایک دو دن گزرنے کے بعد سعید نے شکیب کا ذکر چھیڑ کر فاطمہ سے کہا کہ "آپ ابھی تک اپنے مہمان سے ملیں نہیں حالانکہ وہ صرف مہمان ہی نہیں بلکہ آپ کے شوہر کا بھتیجا بھی ہے اور اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت اچھا انسان ہے۔"

فاطمہ نے اول اول تو اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب سعید کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ "ہاں، شکیب کی تعریف میرے شوہر نے بھی کی تھی۔ لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اپنے شوہر کی غیبت میں کسی نوجوان مرد سے ملنا میرے لئے کہاں تک مناسب ہے۔ علاوہ اس کے میں یوں بھی ہر اس چیز سے علٰحدہ رہنا چاہتی ہوں جو کیفیات شباب کی یاد مجھے دلائے۔"

سعید تو یہ بات سن کر چلا گیا۔ لیکن فاطمہ نے یہ سوچ کر کہ یوں دور سے شکیب کو دیکھ لینا شاید گناہ نہ ہو چلمن کی اوٹ سے نیچے دیکھا تو شکیب صحن میں ٹہل رہا تھا اور گنگنا رہا تھا۔

فاطمہ کی زندگی میں یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ اس نے احساسِ شباب سے واقف ہونے کے بعد واقعی کسی پُر شباب مرد کو دیکھا ہو وہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چچا بھتیجے میں کتنا فرق ہے۔ شکیب نہایت خوبصورت سڈول جسم کا انسان تھا، اور سوائے اس کے

کی نقشہ میں تو ضرور تھوڑی سی مشابہت پائی جاتی تھی، شکیب اور مختار آفندی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شکیب کو دیکھتے ہی اسے اپنے شوہر کی بڑی داڑھی، موٹی بھدی ناک اور ٹیڑھی کمر یاد آگئی اور اس نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ بیک وقت دماغ میں ان دو تصویروں کا اجتماع بھی شاید جائز نہیں اور اس نے اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کی کہ کیوں اس نے شکیب کو دیکھا۔

دو ہفتے گزر گئے اور اس دوران میں وہ بڑی مشکل سے شکیب کے نقوش کو اپنے دماغ سے نکالنے میں کامیاب ہوسکی۔ اس نے سعید سے کہدیا تھا کہ آئندہ شکیب کا نام بھی اس کے سامنے نہ لیا جائے اس لئے وہ بھی خاموش رہا اور اس طرح فاطمہ آہستہ آہستہ اپنے دل سے اُس داغ کے مٹانے میں کامیاب ہوگئی، جس نے ابھی زخم کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

ایک رات وہ اپنے شوہر کے خیال کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھی کہ نیچے صحن سے شکیب کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ چونک پڑی۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، وہ بیتابانہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے چاہا کہ چلمن کو اُٹھا کر شکیب کو دیکھے، لیکن پھر رک گئی۔ گانے کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی اور اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جارہا تھا۔ آواز کی دلکشی، جس میں جذبات کی آگ بھی کام کر رہی تھی، فاطمہ کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی کہ اگر وہ چیخ مار کر باہر نہ نکل پڑی تو بیہوش ہوکر گر جائے گی۔ شکیب کی آواز اور بلند ہوتی جارہی تھی اور گیت کے بول جو جذبات محبت میں ڈوبے ہوئے تھے، فاطمہ کی رگ رگ میں نشتر بن کر دوڑ رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بے اختیارانہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ احساس میں پھر ردعمل شروع ہوا اور اس نے کوشش کی کہ شکیب کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لئے اس کے نقائص تلاش کرے اور آخر کار اس نے شکیب کی اس اخلاقی کمزوری کو سامنے رکھ کر کہ وہ رات کو اس قدر آزادی اور بیباکی کے ساتھ کیوں اسکے کمرے کے پاس گا رہا ہے۔ دروازہ بند کر لیا اور دونوں کانوں پر تکیے رکھ کر (تاکہ وہ شکیب کی آواز نہ سن سکے) لیٹ گئی۔

اس واقعہ کو بھی تین دن گزر گئے اور فاطمہ نے ایک لمحہ کے لئے بھی دریچہ نہیں کھولا کہ مبادا شکیب یا اس کی آواز کا پھر اسے مقابلہ کرنا پڑے۔ لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس دوران میں شکیب نہ اپنے کمرے سے باہر آیا، نہ باہر صحن میں نکل کر اس نے کوئی نغمہ چھیڑا۔ فاطمہ کو اُلجھن تھی کہ اس کا سبب معلوم کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے خود شکیب کا نام لیا اور ایک میزبان کی حیثیت سے اس کی صحت و عافیت دریافت کی۔

سعید نے نہایت مغموم لہجہ میں جواب دیا کہ وہ تو تین دن سے بیمار ہے اور آج حالت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے" فاطمہ یہ سُن کر چونک پڑی، اس کے دل کو تکلیف ہوئی اور اپنی بداخلاقی پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ اس نے سعید سے پوچھا کہ "تم نے کیوں اس وقت تک اطلاع نہیں دی۔" لیکن سعید نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا اور بولا کہ "مناسب یہی ہے کہ آپ خود جا کر مزاج پرسی کریں کیونکہ شکیب علاوہ مہمان ہونے کے آپ کے شوہر کا بھتیجا بھی ہے اور یہ بات بہت بُری ہے کہ وہ بیمار ہو اور آپ اس کی عیادت کو نہ جائیں۔"

فاطمہ جو شکیب کی بیماری کا حال سن کر پہلے ہی بیتاب ہوگئی تھی۔ چادر سر پر ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سعید سے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ لیکن حال یہ تھا کہ دل بلیوں اُچھل رہا تھا اور پاؤں ایک ایک من کا تھا۔

جس وقت وہ شکیب کے حجرے میں داخل ہوئی اس کا جسم کانپ رہا تھا، ریشہ ریشہ تھر تھرا رہا تھا اور شاید وہ دروازے پر گر جاتی اگر شکیب اٹھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا۔

فاطمہ بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن بالکل خاموش، نہ وہ شکیب کو دیکھنا چاہتی تھی اور نہ اس کے منھ سے کوئی لفظ نکل رہا تھا۔ اس سکوت کو توڑنے کے لئے سعید نے شکیب سے کہا کہ "آپ کی بیماری کا حال ان کو بالکل معلوم نہ تھا ورنہ شاید اس سے پہلے ہی آپ کی عیادت کے لئے آتیں۔"

یہ کہہ کر سعید چلا گیا، لیکن اس تنہائی نے فاطمہ کی زبان کو اور زیادہ مقفل کر دیا۔ اور بدستور خاموش بیٹھی رہی تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد شکیب نے کہا کہ "میں آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت شکرگزار ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ اس سے مجھے کتنی راحت پہنچی ہے۔ سنا کرتا تھا کہ بعض انسان مسیحائی بھی کر سکتے ہیں اور آج میں نے خود اس کا تجربہ کر لیا۔ کیونکہ میں اب اپنے آپ کو بالکل تندرست پاتا ہوں"۔

فاطمہ۔ "آپ کو کیا شکایت ہے؟"

شکیب۔ "مجھے معلوم نہیں!"

فاطمہ۔ "لیکن آپ تو خود طبیب ہیں، آپ کو جاننا چاہیئے"۔

شکیب۔ "ہاں یہ وہ مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے"۔

فاطمہ۔ "تاہم کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا چاہیئے"۔

شکیب۔ "ہے! اور اس سے میں واقف بھی ہوں"۔

فاطمہ۔ "فرمایئے!"

شکیب۔ "سچ پوچھئے تو میری بیماری کی ابتدا اسی دن سے ہوتی ہے جب میں اس مکان میں داخل ہوا اور میں نے چلمن کے پیچھے کسی کی جھلک دیکھی۔ اس کے بعد جب نگاہوں سے میرے دل پر تیر چلائے گئے تو میری حالت اور زیادہ سقیم ہوگئی اور پھر جب چہرہ دکھا کر دفعتاً چھپا لیا گیا، تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ میری زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا ہے اور میں چند ساعت کا مہمان ہوں۔" شکیب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، لیکن فاطمہ نے نہ شکیب کی اس دلدوز داستان کی پروا کی نہ اس کی اشکباری کی، وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس دن کی شام ہوگئی۔ لیکن کس کرب و اضطراب کے عالم میں۔ اس کا علم صرف فاطمہ کو تھا یا شکیب کو۔ فاطمہ جانتی تھی کہ جو آگ اس کے دل میں بھڑک رہی تھی اس نے شکیب کو بھی تڑپا رکھا ہے۔ اور اگر یہ دونوں شعلے کسی وقت مل گئے تو ممکن ہے شکیب صبر و ضبط سے کام لے سکے، لیکن وہ یقیناً جل کر خاک ہو جائے گی، اس لئے اس نے عہد کیا کہ اب وہ شکیب کے پاس نہ جائے گی لیکن ابھی اس عزم پر وہ استوار بھی نہ ہوئی تھی کہ سعید دوڑا ہوا آیا اور بولا کہ "شکیب کی حالت بہت نازک ہے اور شاید وہ دم توڑ رہا ہے"۔

فاطمہ گھبرا کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور شکیب کے حجرے کی طرف چل دی اور وہ اندر پہنچی ہی تھی کہ شکیب نے بیتابانہ اپنی آغوش کھول دی اور بولا کہ "اے فاطمہ میری زندگی ختم ہو رہی ہے، اس لئے اگر میں ایک بار تمہارے سر کو اپنے سینے سے لگا سکا تو ممکن ہے میری روح کو کچھ سکون ہو، ورنہ مرنے کے بعد بھی میرا یہ درد کم نہ ہوگا"۔

فاطمہ کچھ جھجکی اور چاہا کہ لپٹ جائے لیکن یہ سمجھ کر کہ اب وقت صاف صاف بات کرنے کا ہے بولی کہ "اے شکیب، تمھیں

معلوم ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میرا شوہر تمہارا اچھا ہے۔ اس لئے تمہیں سوچنا چاہئے کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور میں کیوں کر اسے منظور کر سکتی ہوں۔"

شکیب :۔ میں یہ سب جانتا ہوں، لیکن کیا کروں محبت اپنے اختیار کی چیز نہیں، علاوہ اس کے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرا چچا ذیابیطس میں مبتلا ہے اور چند دن سے زیادہ اسے جینا نہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم میری محبت کو رد کرو جس کی عمر شاید زیادہ پائدار ثابت ہو۔"

فاطمہ :۔ "یہ سب صحیح ہے، لیکن جب تک میرا شوہر زندہ ہے، میں کبھی اس خیانت کی مجرم نہیں ہو سکتی۔"

شکیب :۔ "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں مرجاؤں۔"

فاطمہ :۔ اگر آپ مر گئے (حالانکہ میں یہ نہیں چاہتی) تو میں یقیناً آپ کے شباب پر آنسو بہاؤں گی اور آپ کی محبت ہمیشہ یاد رکھوں گی، لیکن، زندگی میں تو شاید میں یہ بھی نہ کر سکوں گی۔"

فاطمہ یہ کہہ کر فوراً باہر نکل گئی اور شکیب کو جواب دینے کا بھی موقعہ نہ دیا۔

شکیب کو گئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور فاطمہ بدستور اپنے مکان میں مختار آفندی کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک دن شام کو دفعتاً سارے قاہرہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ، حکومت عثمانی میں انقلاب ہو گیا اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے..... اور..... اس خبر کے ساتھ ہی فاطمہ کے مکان پر لوگوں کا ہجوم ہونے لگا اور خوشی کے نعرے ہر طرف سے بلند ہونے لگے۔ فاطمہ حیران تھی کہ یہ کیا بات ہے اور اس نے دریچہ سے سر نکال کر ان لوگوں کو دیکھنا ہی چاہا تھا کہ اس مجمع میں اسے مختار آفندی بھی نظر آیا، جس سے لوگ گلے مل رہے تھے اور کامیابی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ سعید بھی قریب ہی تھا۔

مختار آفندی نے اس جلسہ تہنیت کے بعد فاطمہ کے حجرے کا رخ کیا، لیکن سعید سامنے آگیا اور بولا کہ اب آپ اس طرح نہیں جا سکتے اور یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ داڑھی پر ڈالا اور دوسرا ناک پر تو داڑھی بھی الگ ہو گئی اور ناک کا خول بھی جدا ہو گیا۔ فاطمہ یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مختار آفندی اور شکیب ایک ہی شخص ہے۔

اس کے کئی دن بعد فاطمہ کو معلوم ہوا کہ۔ مختار آفندی" نوجوان ترکوں کی جماعت کا بڑا سر برآوردہ شخص تھا اور وضع و صورت بدل کر مصر آگیا تھا تاکہ حکومت عثمانی کے جاسوس اس کو گرفتار نہ کر سکیں۔

نظیر نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ، جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اسکا فارسی اور اردو کلام میں عارفانہ رنگ، انکی قدرت بیان و زبان، اسکا معیاری تغزل۔ ادبیات اردو میں اس کا فنی و لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعر اور کا ذوق معاصرین کی رائیں مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور انکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت تین روپے

"نگار پاکستان" ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

حضرت عائشہؓ کی عمر وقت ازدواج

مولانا تمنا عمادی

حضرت عائشہ کا نکاح کس عمر میں ہوا، اور صغر سنی کے باب میں احکام اسلامی کیا ہیں، ان دو باتوں کی طرف میں نے مولانا تمنا عمادی کو متوجہ کیا تو انھوں نے اپنے خیالات مختصراً قلمبند کر کے مجھے بھیج دئے، ہر چند اس کی حیثیت کسی مستقل مضمون کی نہیں ہے، بلکہ محض ذاتی خط کی سی ہے، تاہم جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے مسئلہ زیر بحث پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اس وقت جو حضرات ان مسائل پر غور کر رہے ہیں اُن کے لئے مولانا تمنا کے یہ مختصرات بھی یقیناً بہت مفید و کارآمد ثابت ہوں گے۔

نیاز

(باب نکاح الرجل ولدہ الصغار) ... ... حدثنا محمد بن یوسف (الفریابی) حدثنا سفیان (الثوری) عن ھشام (بن عروۃ) عن ابیہ عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوجھا وھی بنت ست سنین وادخلت علیہ وھی بنت تسع ومکثت عندہ تسعاً

محمد بن یوسف الفریابی قبیلہ الضبی کے آزاد کردہ غلام تھے، ساحل شام پر قیساریہ میں وارد ہوئے، کوفے میں آ کے اعمش مشہور شیعہ محدث کی صحبت میں کچھ دنوں رہے پھر فطر بن خلیفۃ الکوفی شیعہ محدث کی صحبت میں رہے، سفیان ثوری کوفی کے ساتھ بہت رہے مگر ثوری کے شاگردوں میں یہ دوم درجے پر سمجھے جاتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۵۳۶ میں ہے قال ابن ابی خیثمہ سئل ابن معین عن اصحاب الثوری ایھم اثبت؟ قال ھم خمسۃ (یحیی بن سعید) القطان ووکیع وابن المبارک وابن مھدی وابو نعیم۔ واما الفریابی وابو حذیفہ وقبیصۃ وعبید اللہ بن موسی وابو احمد الزبیری وعبد الرزاق وابو عاصم والطبقہ کلھم دونھم۔ غرض محمد بن یوسف الفریابی تلامذہ ثوری میں دوم درجے کے لوگوں میں ہیں، صفحہ ۵۳۷ میں ہے قال بعض البغدادیین اخطأ محمد بن یوسف فی خمسین حدیثاً من حدیث سفیان وقال ابن عدی لہ قرآءات عن الثوری ولہ حدیث کثیر من الثوری اس لئے یہ حدیث چونکہ سفیان ثوری کے درجہ اول کے تلامذہ نہیں روایت کرتے صرف فریابی ہی تنہا روایت کرتے ہیں،

ان کے برابر والے بھی روایت نہیں کرتے اس لئے ان کی جس حدیث کی متابعت کوئی دوسرا نہیں کرتا وہ حدیث ضرور محل نظر ہے۔ فریابی کی ولادت ۱۲۰ھ میں اور وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی بماہ ربیع الاول،

سفیان ثوری کوفی مشہور محدث ہیں مگر ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۵۰ میں لکھتے ہیں: الثوری لیس من مذھبہ ترک الروایۃ عن الضعفاء (ترجمہ جابر بن یزید الجعفی الکوفی الرافضی) پھر یہ مدلس بھی تھے تہذیب التہذیب جلد ۷ صفحہ ۸۰ ترجمہ عبیدہ بن مُعَتَّب الضبی الکوفی میں لکھتے ہیں: کان الثوری اذا روی عنہ کناہ قال ابو عبد الکریم قال و سفیان لا یکاد یکنی رجلاً الا وفیہ ضعف اور یہ عبیدہ بن معتب متروک الحدیث غیر ثقہ لیس بشئی تھے مگر ثوری ان سے روایت کرتے تھے لیکن ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کی کنیت بیان کرکے روایت کرتے تھے اور سنیئے ثوری کے آخر ترجمہ میں لکھتے ہیں۔ وقال ابن المبارک حدث سفیان بحدیث فجئتہ وھو یدلسہ فلما رآنی استحیی وقال نرویہ عنک جلد ۴ صفحہ ۱۱۵ میں بضمن ترجمہ ثوری لکھتے ہیں ولکن مالکاً کان ینتقی الرجال و سفیان یروی عن کل احد ثوری کی ولادت ۹۷ھ کی ہے اور وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی مگر ثوری کوفے سے ۱۵۰ھ میں بصرے چلے آئے تھے اور پھر بصرے میں رہے اور وہیں وفات پائی؛

محمد بن یوسف جس وقت کوفے آئے تھے وہ سلیمان بن مہران الاعمش کا اخیر وقت تھا۔ اعمش کی وفات ربیع الاول ۱۴۸ھ میں ہوئی اسی لئے محمد بن یوسف کے ترجمے میں تہذیب التہذیب میں صرف "ادرک الاعمش" لکھا ہے سمع عن اعمش یا روی عن اعمش نہیں لکھا ہے۔ اعمش نے (۸۸) برس کی عمر پائی تھی (تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۲۲۴) اور ثوری ۱۵۰ھ میں بصرے چلے آئے تھے مگر محمد بن یوسف کوفے میں رہے فطر بن خلیفہ وغیرہ کی صحبت میں ڈیڑھ دو برس میں یہ سفیان ثوری سے کتنا فیض اٹھا سکے ہوں گے،

ہشام بن عروہ جب تک مدینے میں رہے اہل مدینہ کی روش پر رہے مگر بار بار کوفے کے جانے آنے نے ان کو کوفیوں کی روش سکھا دی۔ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۵۰ میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں: قال یعقوب بن شیبۃ ثقۃ ثبت لم ینکر علیہ شئی الا بعد ما صار الی العراق فانہ انبسط فی الروایۃ عن ابیہ فانکر ذلک علیہ اھل بلدہ (اے اہلحدیث) والذی نری ان ھشاماً تسھل لاھل العراق انہ کان لا یحدث عن ابیہ الا بما سمعہ منہ فکان تسھلہ انہ ارسل عن ابیہ مما کان سمعہ من غیر ابیہ عن ابیہ وقال ابن خراش کان مالک لا یرضاہ۔ پھر لکھتے ہیں: بلغنی ان مالکاً نقم علیہ حدیثہ لاھل العراق۔ قدم الکوفۃ ثلاث مرات۔ قدمۃ کان یقول حدثنی ابی قال سمعت عائشۃؓ وقدم الثانیۃ فکان یقول اخبرنی ابی عن عائشۃؓ۔ وقدم الثالثۃ فکان یقول ابی عن عائشۃؓ ... اور صفحہ ۵۱ میں ہے قال الآجری عن ابی داود لم یحدث ھشام بن عروۃ بحدیث ام زرعؔ ھجرہ ابو الاسود یتیم عروۃ۔ وقال العقیلی قال ابن لھیعۃ کان ابو الاسود یعجب من حدیث ھشام عن ابیہ وربما مکث سنۃ لا یکلمہ۔ قال ابو الاسود لم یکن احد یرفع حدیث ام زرع غیرہ۔ اس تصریح سے اس کا پتا ضرور ملا کہ ہشام اہل کوفہ کی صحبت میں

ؔ وحدیث ام زرع فی البخاری جلد ۲ صفحہ ۷۷۹ الی صفحہ ۷۸۰ فی باب حسن المعاشرۃ مع الاھل

رہ کر بہت بہک گئے تھے اور وہ جو روائتیں اپنے والد سے عن ابی عن عائشہ کہہ کر روایت کرتے تھے اہل مدینہ ان کی بیان کردہ ان حدیثوں کو قابل وثوق نہیں سمجھتے تھے، خصوصاً جب ان سے روایت کرنے والے بھی ایک کوفی ہی محدث سفیان ثوری ہوں جو خود غیر محتاط تھے اور ہر طرح کی رطب و یابس حدیث جو کچھ جس سے سنتے تھے، روایت کرتے رہتے تھے یا ایسے شخص ہوں پھر اس حدیث کی متابعت بھی کوئی دوسرا محدث نہ کرتا ہو تو ایسی روایت کس طرح صحیح و معتبر سمجھی جا سکتی ہے،

اس کی ایک متابعت جو معلے بن اسد متوفی فی رمضان ۲۱۸ھ و ۸۳۳ء کو وہیب بن خالد البصری باہلیوں کے آزاد کردہ غلام سے (متوفی ۱۶۵ھ و ۷۸۱ء بعمر ۵۸ سال تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۱۷۰) ہے۔ مگر یہ وہیب انھیں ہشام بن عروہ سے روایت کرتے ہیں تو جب ہشام بن عروہ ہی کی روایت غیر معتبر ہے تو ان کے بعد والوں کی متابعت کیا مفید ہو سکتی ہے،

پھر ایک متابعت بر صفحہ ۷۷۵ میں باب من بنی بامراتہ وھی بنت تسع سنین۔ حدثنا قبیصۃ بن عقبۃ قال حدثنا سفیان عن ھشام بن عروۃ عن عروۃ. تزوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم عائشۃ رض وھی ابنۃ ست وبنی بھا وھی ابنۃ تسع ومکثت عندہ تسعاً۔ اس میں بھی وہی سفیان اور وہی ہشام ہیں اور قبیصہ تو فریابی سے بھی کم درجے کے راوی ہیں ایسی متابعتوں کو متابعت نہیں کہتے، یہ تو صرف تحویلیں ہیں اور یہاں عن عائشۃ بھی نہیں ہے۔

وفی الصحیح لمسلم

حدثنا ابو کریب محمد بن العلاء قال نا ابو اسامۃ ح قال وحدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ قال وجدت فی کتابی عن ابی اسامۃ عن ھشام عن ابیہ عن عائشۃ رض قالت تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لست سنین وبنی بی وانا ابنۃ تسع سنین قالت فقدمنا المدینۃ فوعکت شہراً فوفی شعری جمیمۃ فاتتنی ام رومان وانا علی ارجوحۃ ومعی صواحبی فصرخت لی فاتیتھا وما ادری ما ترید بی فاخذت بیدی فاوقفتنی علی الباب فقلت ھہ ھہ حتی ذھب نفسی فادخلتنی بیتاً فاذا نسوۃ من الانصار فقلن علی الخیر والبرکۃ وعلی خیر طائر فاسلمتنی الیھن فغسلن راسی واصلحننی فلم یرعنی الا ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحی فاسلمننی الیہ۔ وحدثنا یحیی بن یحیی قال انا ابو معاویہ عن ھشام بن عروۃ ح قال وحدثنا ابن نمیر واللفظ لہ قال نا عبدۃ عن ھشام عن ابیہ عن عائشۃ قالت تزوجنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانا بنت ست سنین وبنی بی وانا بنت تسع۔

وحدثنا عبد بن حمید قال انا عبد الرزاق قال نا معمر عن الزھری عن عروۃ عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوجھا وھی بنت سبع سنین وزفت الیہ وھی بنت تسع سنین ولعبھا معھا ومات عنھا وھی بنت ثمان عشرۃ،

مسلم کی بھی سب حدیثوں میں وہی ہشام بن عروہ ہیں۔ صرف آخری حدیث میں زہری بجائے خود عروہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں مگر زہری کی روایت عروہ بن الزبیر سے صحیح نہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۴۵۰ ترجمہ محمد بن شہاب الزہری میں لکھا ہے ولکن لا یثبت لہ السماع من عروۃ وان کان قد سمع ممن ھو اکبر منہ غیر ان اھل الحدیث اتفقوا علی ذلک واتفاقھم علی الشئ یکون حجۃ۔ ابن حجر پہلے اس کا اعتراف کرتے ہیں لا یثبت لہ السماع من عروۃ وان کان قد سمع ممن ھو اکبر منہ، مگر چونکہ بخاری و مسلم میں زہری کی بہت سی روایتیں بلا واسطہ عروہ سے ہیں اور بخاری کی شرط

عہ مطبوعہ نسخہ میں شعراً ہی ہے مگر صحیح شعر ہے ۱۲ تمنا

لوگوں نے فرض کرلی ہے، کہ ان کے نزدیک راوی اور مروی عنہ دونوں کے درمیان لقاء و سماع ثابت ہو جبھی بخاری ایسے راوی کی حدیث اپنی صحیح میں درج کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ خود امام بخاری نے اپنی یہ شرط کبھی لکھی نہیں ہے تو یہ عی سست گواہ چست جس بات کا دعویٰ خود مدعی یعنی امام بخاری نہیں کر رہے ہیں اس کی گواہی بعد والے سارے محدثین یک زبان ہو کر بالاتفاق اگر دیں تو یہ ان کا غایت حسن ظن ہی کہا جائے گا۔ پھر آخر لا یثبت سماعہ عن عروۃ کس بنا پر لکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے متقدمین جو زہری کے ہم عصر یا ان کے زمانے سے قریب تر تھے ان کے نزدیک زہری کا سماع عروہ سے ثابت نہ تھا مگر متاخرین نے بخاری کی بہت سی حدیثیں عن الزہری عن عروۃ دیکھ کر گھبرائے اس لئے کہ یہ ساری حدیثیں مرسل ٹھہر جاتی ہیں، اور ان زہری صاحب کے مرسلات کو اکابر محدثین بمنزلہ الریح سمجھتے تھے، تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۴۵۱ میں ترجمہ زہری میں لکھتے ہیں کان یحیی بن سعید لا یری ارسال الزھری وقتادۃ شیئا ویقول ھو بمنزلۃ الریح ویقول ھولاء قوم حفاظ کانوا اذا سمعوا الشئ علقوہ۔

اور امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۰۴ میں آخر صفحہ میں لکھا ہے کہ قال ابو قدامۃ السرخسی قال یحیی بن سعید مرسل الزھری شر من مرسل غیرہ۔ لانہ حافظ وکلما قدر ان یسمی سمی وانما یترک من لا یستجیز ان یسمیہ اس لئے یقیناً ابن شہاب نے یہاں ہشام بن عروۃ کا نام چھوڑ کر خود بلا واسطہ عروہ سے یہ حدیث روایت کی ہے اسی لئے ذرا فرق بھی کر دیا ہے یعنی ست کو سبع بنا کر حدیث روایت کی ہے۔

نسائی کی حدیث

اخبرنا اسحٰق بن ابراھیم قال اخبرنا ابو معاویہ قال ثنا ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تزوجھا وھو بنت ست ودخل بھا وھی بنت تسع اخبرنا محمد بن النضر بن مساور قال ثنا جعفر بن سلیمان عن ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ قالت تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لسبع سنین ودخل علی لتسع سنین۔ اخبرنا شیبۃ قال ثنا عبثر عن مطرف عن ابی اسحٰق (السبیعی) عن ابی عبیدۃ (وھو ابن عبد اللہ بن مسعود) قال قالت عائشہؓ تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لتسع سنین وصحبتہ تسعا۔ اخبرنا محمد بن العلاء واحمد بن حرب قالا ثنا ابو معاویہ عن الاعمش عن ابراھیم عن الاسود عن عائشہ تزوجھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی بنت تسع ومات عنھا وھی بنت ثمانی عشرۃ۔

وفی ابوداود

حدثنا سلیمان بن حرب وابو کامل قالا نا حماد بن زید عن ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ قالت تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا بنت سبع۔ قال سلیمان او ست۔ ودخل بی وانا بنت تسع

وفی ابن ماجۃ

حدثنا سوید بن سعید ثنا علی بن مسھر ثنا ھشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنھا قالت تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا بنت ست سنین فقدمنا المدینۃ فنزلنا فی بنی الحارث بن الخزرج فوعکت فتمرق شعری حتی وفی جمیمۃ فاتتنی امی ام رومان وانی لفی ارجوحۃ ومعی صواحبات لی فصرخت بی فاتیتھا وما ادری ما ترید فاخذت بیدی فاوقفتنی علی باب الدار وانی لانھج حتی سکن بعض نفسی ثم اخذت شیئا من ماء فمسحت بہ علی وجھی وراسی ثم ادخلتنی الدار۔ فاذا نسوۃ من الانصار فی بیت فقلن علی

الخیر والبرکۃ وعلی خیر طائر فاسلمتنی الیہن فاصلحن من شانی فلم یرعنی الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسلمنی الیہ وانا یومئذ بنت تسع سنین۔

حدثنا احمد بن سنان ثنا ابو احمد ثنا اسرائیل عن ابی اسحٰق عن ابی عبیدہ عن عبد اللہ قال تزوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ وھی بنت سبع وبنی بھا وھی بنت تسع وتوفی عنھا وھی بنت ثمانی عشرۃ (ابن ماجہ، صفحہ ۱۳۶)

(۱) ابو معاویہ ھو محمد بن خازم التیمی السعدی قبیلہ تیمی السعدی کے آزاد کردہ غلام تھے، آٹھ برس کی عمر ہی میں اندھے ہو گئے تھے اسی لئے ابو معاویہ الضریر ان کو لوگ کہتے ہیں۔ ان سے اسحٰق ابن ابراہیم جو اسحٰق بن راہویہ سے مشہور ہیں روایت کرتے ہیں اور یہ ہشام بن عروہ سے۔ اعمش شیعہ محدث کے خاص شاگرد تھے۔ قال عبد اللہ بن احمد سمعت ابی یقول ابو معاویہ الضریر فی غیر حدیث الاعمش مضطرب لا یحفظھا حفظاً جیداً۔ روی ابو معاویہ عن عبد اللہ بن عمر مناکیر ... وربما دلس وکان یری الارجاء قال الآجری عن ابی داؤد کان مرجیاً وقال مرۃ کان رئیس المرجیۃ بالکوفۃ۔ وھو فی الاعمش ثقہ وفی غیرہ فیہ اضطراب وذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال کان حافظاً متقناً ولکنہ کان مرجیاً خبیثاً۔ قال ابن سعد کان ثقۃ کثیر الحدیث یدلس وکان مرجیاً وقال ابو داؤد قلت لاحمد کیف حدیث ابی معاویہ عن ھشام بن عروہ قال فیھا احادیث مضطربۃ یرفع منھا احادیث الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابو معاویہ الضریر درحقیقت شیعہ تھے اسی لئے اعمش کے خاص شاگرد تھے، شیعہ کے موافق حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے شیعہ رواۃ عموماً اپنا تشیع اعتزال اور ارجاء کے پردے میں چھپایا کرتے تھے۔ بہرحال یہ عجمی الاصل آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے اس کو یاد رکھئے (ان کا ترجمہ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۱۳۷ سے ۱۳۹ تک ہے)

(۲) جعفر بن سلیمان الضبعی البصری۔ یہ بنی الحریش کے آزاد کردہ غلام تھے۔ قال ابو طالب عن احمد لا باس بہ قیل لہ ان سلیمان بن حرب یقول لا یکتب حدیثہ فقال انما کان یتشیع وکان یحدث احادیث فی فضل علی واھل البصرۃ یغلون فی علی۔ کان یحیی بن سعید لا یکتب عنہ وکان لا یروی عنہ ویستضعفہ وقال ابن المدینی اکثر عن ثابت وکتب مراسیل وفیھا احادیث مناکیر۔ قال البخاری یقال کان امیاً قال ابن سعد کان ثقۃ وبہ ضعف وکان یتشیع۔ اور یہ جعفر بن سلیمان فقط شیعہ ہی نہ تھے، بلکہ شیعہ گر و شیعہ ساز بھی تھے، چنانچہ سابق عبارت کے بعد تہذیب التہذیب میں ان کے ترجمے میں ہے کہ قال جعفر الطیالسی عن ابن معین سمعت عن عبد الرزاق کلاما یوما فاستدللت بہ علی ما ذکر عنہ رای علی التشیع من المذھب قلت لہ ان استاذیک الذین اخذت عنھم ثقات کلھم اصحاب سنۃ فعمن اخذت ھذا المذھب فقال قدم علینا جعفر بن سلیمان فرأیتہ فاضلاً حسن الھدی فاخذت ھذا عنہ قال الخضر بن محمد بن شجاع الجوزی قیل لجعفر بن سلیمان انک تشتم ابا بکر وعمر؟ قال اما الشتم فلا ولکن بغضاً یا لک۔ وحکی عنہ وھب بن بقیۃ نحو ذلک، اور ان کی طرف سے صفائی بھی پیش کی گئی ہے وہ بھی دیں پڑھ ہے قال ابن عدی عن زکریا الساجی واما الحکایۃ التی حکیت عنہ فانما عنی بہ جارین کان لہ قد تاذی بھما یکنی احدھما ابا بکر ویسمی الآخر عمر فسئل عنھما فقال اما السبۃ

فلا ولکن بغضا یا لک۔ ولم یعن بہ الشیخین او کما قال۔ یہ کس قدر بودی تاویل ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا تشیع مشہور و معروف ہے جو دوسروں کو شیعہ بنا رہا ہے اُس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم ابو بکر و عمر کو بُرا بھلا کہتے ہو؟ کیا پوچھنے والا اُس کے پڑوسیوں کے متعلق پوچھ رہا تھا؟ کیا جعفر بن سلیمان نے سائل کے سوال سے یہی سمجھا تھا کہ سائل میرے پڑوسیوں کے متعلق پوچھ رہا ہے؟ چونکہ جعفر بن سلیمان خوب جانتے تھے کہ لوگ مجھ کو شیعہ جانتے ہیں اس لئے یہ سوال میرے پڑوسیوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ شیخین کے متعلق ہے ورنہ سائل ضرور یوں پوچھتا ھل تشتم جاریک ابا بکر و عمر؟ ورنہ یہ جواب دیتے کہ لا اتستم جارئی ابا بکر و عمر الخ یہ نہایت مبتذل بودی اور گندی تاویل جعفر بن سلیمان کی طرف سے صفائی میں پیش کی گئی ہے مگر تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی حدیثوں میں منکرات کے وجود کا بھی ذکر کرتے ہیں پھر ان کو ان کے تشیع کے باوجود ثقہ بھی لکھتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ صحاح میں ان کی حدیثیں موجود ہیں۔

مبشر بن القاسم الزبیری الکوفی۔ مطرف بن طریف الکوفی۔ ابو اسحٰق السبیعی الشیعی الکوفی۔ ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن مسعود رضؓ وہ بھی کوفی۔ لوگوں نے ان کا نام عامر رکھ لیا ورنہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۷۵ ان کا ترجمہ ہے اس لا یعرف اسمہ ولم یسمع من ابیہ شیئا۔ پھر صفحہ ۷۶ میں لکھتے ہیں قال الترمذی فی العلل الکبیر قلت ابو عبیدہ ما اسمہ فلم یعرف اسمہ وقال ھو کثیر الغلط۔ امام ترمذی نے جو محمدؔ لکھا ہے مراد محمد بن اسمٰعیل امام بخاری ہیں پھر ابو اسحٰق السبیعی مشہور شیعہ محدث کوفہ ان سے روایت کرتے ہیں جو حدیث ہی فقط نہیں صحابہ بھی تصنیف کر کے اپنے تصنیف کردہ صحابہ سے روایت کرتے تھے تقریباً ایسے ستر شخصوں سے یہ روایت کرتے تھے جن سے کبھی کسی نے کوئی روایت نہیں کی بلکہ جن کے نام سے بھی لوگ اگر واقف ہوتے تو انھیں کے ذریعے۔

نسائی کی ایک حدیث اور ابن ماجہ کی ایک حدیث انھیں ابو عبیدہ سے عن ابیہ کہکے مروی ہے۔ اور انھیں اپنے والد سے کچھ سننا نصیب ہی نہوا تو پھر ان دونوں روایتوں کو سمجھ لیجئے کہ خاص کوفے کی ٹکسال میں گھڑی گئی ہیں۔

باقی صرف ایک حدیث نسائی کی جو ابو العلاء بن کریب ابو کریب الہمدانی الکوفی سے مروی لاکھ سے زیادہ حدیثوں کے مالک تھے صرف موسیٰ بن اسحٰق الانصاری نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنیں، امام بخاری کے شیخ تھے اور امام مسلم کے بھی اس لئے کچھ بولنے کا کسی کو موقع نہ تھا مگر یہ ہمدانی تھے اور کوفی تھے، کوفے میں ہمدانیوں کا پورا محلہ شیعوں کا تھا اور ان سے شیعوں کے موافق روایتیں بہت مروی ہیں۔ اور ابو معاویہ سے آپ واقف ہو چکے باقی رہے اعمش، ان کا نام سلیمان بن مہران ہے، کوفے کے مشہور شیعہ محدث ہیں حدیث کی کون سی کتاب ہے جس میں اعمش اور ابو اسحاق السبیعی کی حدیثیں نہوں۔ مگر تہذیب التہذیب ترجمہ ابو اسحٰق السبیعی میں لکھا ہے کان قوم من اھل الکوفۃ لا یحمد مذاھبہم وھم رؤس محدثی الکوفۃ مثل ابی اسحٰق والاعمش و منصور و زبید وغیرھم۔ پھر لکھا ہے وحدثنا اسحاق ثنا جریر عن معن (بن عیسیٰ) قال افسد حدیث اھل الکوفۃ الاعمش و ابو اسحٰق۔ وفی میزان الاعتدال انہ ما افسد حدیث اھل الکوفۃ الا ابو اسحٰق والاعمش اور اعمش خود اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے، کوفے کے اسدی قبیلے میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی اور عمرو بن عبداللہ ابو اسحٰق السبیعی ہمدانی تھے۔

اعمش کے شیخ ابراہیم بن یزید بن قیس بن الاسود الکوفی جن کی ولادت ۵۰ھ میں ہوئی مگر حضرت مغیرہ بن شعبہ متوفی ۵۰ھ سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ ان کی وفات ابن حجر نے ۹۶ھ لکھی ہے مگر عمر بتائی ہے ۴۹ برس۔ معلوم نہیں کس حساب سے

بہر حال یہ بھی کوفی ہی ہیں، ممکن ہے سال وفات ۹۶ھ نہ ہو ۹۹ھ ہو۔ لکھنے یا چھپنے کی غلطی ہے۔

ان کے شیخ اور ملنے والوں میں بھی اسود بن یزید بن قیس النخعی الکوفی کہا جاتا ہے کہ یہ جاہلی تھے یعنی زمانہ جاہلیت والے۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان کے ساتھ حج کیا مگر حضرت عثمان سے بغض رکھتے تھے سب سے، روایت کرتے تھے مگر حضرت عثمان سے کبھی کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ ۷۴ھ یا ۷۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی عمر نہیں لکھی اور نہ ان کو طویل العمر لکھا ہے کوفی جاہلی ثقہ لکھنے کے تو یہ معنی ہیں کہ قبل اسلام کا زمانہ پایا تھا۔ عہد نبوی میں اسلام لانا قسمت میں نہ تھا۔ وفات نبوی کے بعد ایمان لائے یا حیات نبوی ہی میں کسی صحابی کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے مگر مدینے آکر زیارت نبوی سے مشرف نہ ہو سکے تو اس حساب سے ان کی عمر سو سے زیادہ ہونا چاہیئے اور ان کا ذکر معمرین میں کیا جاتا۔ یہ بھی منقول نہیں ہے کہ وُلِدَ فی الجاھلیۃ۔ فقط جاہلی لکھنے کے معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں سن شعور رکھتے تھے ان کی وفات کوفے ہی میں ہوئی۔

مختصر یہ ہے کہ اہل کوفہ نے پہلے ہشام بن عروہ سے منسوب کر کے متعدد طرق سے روایتیں مشہور کیں اسی لئے صحیحین میں سب روایتیں ہشام ہی سے ہیں۔ ابن شہاب جو عروہ سے روایت کرتے ہیں وہ ہشام کا نام چھوڑ کر روایت کرتے ہیں عروہ سے ان کی لقا ثابت نہیں اگر واقعی سُنا ہے تو ہشام ہی سے سُنا ہے ورنہ ابن شہاب تو ایسے لوگوں سے بھی بلا واسطہ روایت کرتے ہیں جو ان کی ولادت سے پہلے مر چکے تھے دیکھئے میرا ترجمہ ابن شہاب زہری ماہ ستمبر ۶۰ء کے طلوع اسلام میں۔

کوفیوں کے ساتھ کچھ بصری بھی شریک ہو گئے کوفہ و بصرہ دونوں حدیثوں کی ٹکسال تھے، کوفہ بڑی ٹکسال تھی اور بصرہ چھوٹی عین غین میں نقطے کا فرق ہے۔

(۱) تاریخ طبری، حضرت ابوبکر صدیق کے تذکرے میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر کی چار اولاد یعنی قتیلہ سے عبداللہ اور اسماء اور ام رومان سے عبدالرحمٰن اور حضرت عائشہ صدیقہ۔ یہ چاروں زمانہ جاہلیت میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے تھے[1]

(۲) ہجرت کے وقت حضرت اسماء کی عمر ۲۷ برس بلا اتفاق بیان کی جاتی ہے اور اس پر بھی اہل سیر کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ حضرت اسماء سے دس برس چھوٹی تھیں[2]۔ اس حساب سے ہجرت کے وقت حضرت عائشہ کی عمر ۱۷ برس کی ہوتی ہے اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ حضرت عائشہ کا عقد ہجرت ہی کے سال ہوا تھا، مہینوں کے تفاوت کی وجہ سے ان کی عمر سترہ یا سولہ برس سے کم نہیں ہو سکتی۔

(۳) بخاری کی روایت کہ حضرت عائشہ فرماتی تھیں کہ لم اعقل ابوی الا وھما یدینان الدین کے معنی سمجھنا لم اعرف ابوی تحریف معنوی ہے لم اعقل کا لفظ بتا رہا ہے کہ ان کا مطلب اس قول سے یہ تھا کہ وہ اپنے پڑوس کے لوگوں کو بھی دیکھتی تھیں اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی، مگر جس وقت سے مسلم و غیر مسلم کے فرق کو سمجھنے کی عقل ہوئی اس وقت سے میں نے اپنے والدین کو اسی دین کا پابند پایا اگر وہ اپنے والدین کے اسلام لانے کے بعد پیدا ہوئی تھیں تو یوں نہیں فرماتیں بلکہ یوں فرماتیں کہ ا۔ ولدت من مسلم وبطن مسلمۃ یا فرماتیں کہ انا اول مولودۃ فی الاسلام۔

---

[1] تزوج ابوبکر فی الجاھلیۃ قتیلۃ وھی بنت ... فولدت عبداللہ واسماء وتزوج ایضاً فی جاھلیتہ ام رومان بنت عامر فولدت له عبدالرحمٰن وعائشۃ وکل ھؤلاء الاربعۃ من اولادہ ولدوا من زوجتیه اللتین سمیناھما فی الجاھلیۃ تاریخ طبری [3] البدایۃ والنھایۃ جلد ۸ صفحہ ۳۴۶

[2] حضرت اسماء کی وفات ۷۳ھ میں ننانوے یا سو برس کی عمر میں ہوئی تھی اس حساب سے ہجرت کے وقت وہ ۲۷ برس کی تھیں۔ استیعاب جلد ۲ ص ۷۰۵

(۴) اگر حضرت عائشہ کی عمر نکاح کے وقت ۶ یا ۷ برس کی ہوتی تو ان کو ضرور اول مولود فی الاسلام محدثین اہل سیر لکھتے مگر آج تک کسی نے ایسا نہیں لکھا۔

(۵) پھر یہ بھی اہل سیر لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ پہلے مطعم بن عدی کے بیٹے سے منسوب تھیں جب حضرت خولہ حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیام لے کر حضرت ابوبکر کے پاس گئی ہیں تو حضرت ابوبکر مطعم بن عدی کے پاس گئے تاکہ ان سے صفائی کر لی جائے تو مطعم بن عدی کے بیٹے سے منسوب، حضرت ابوبکر نے جو طے کی تھی اس وقت حضرت عائشہ کی کتنی عمر تھی؟

کیا عرب میں ایسا دستور تھا کہ ہر چار یا پانچ برس کی لڑکی کی منسوب کر کے کسی کے ساتھ طے کر لی جائے؟ کیا کوئی اور مثال اس کی نظر آتی ہے۔

لکھنے والے کچھ نہ کچھ حرفِ غلط لکھتے رہے
بس اُنہی حرفوں سے میری داستاں بنتی گئی

سالنامہ ۱۹۶۴ء

تذکروں کا تذکرہ نمبر

جس نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن اسکی امتیازی روایات، تذکرہ نگاری کا رواج، اُردو فارسی میں تذکروں کی صحیح تعداد اور اُن کی نوعیت کیا ہے اور کن شعراء کا ذکر آیا ہے۔ نیز ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے۔ ان تذکروں میں اُردو فارسی زبان و ادب کا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے۔

قیمت چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

سرور جہاں آبادی

محمد یونس خالدی

اردو شاعری کا آغاز کس دور اور کس سن میں ہوا، اس کا تعین مشکل ہے۔ لیکن اردو شاعری کا ستارہ اس وقت چمکا، جبکہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ شاعری نے ایک پیشہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور اس پیشے نے ہر دور کے باکمال شعرا کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی متاع ہنر کے لئے اچھے سے اچھے خریدار فراہم کریں۔ لیکن یہ شاعری صرف دل کی شاعری تھی۔ اس لئے شعر کا اثر براہ راست دل پر ہوتا تھا، شعر سنتے ہی دل پر چوٹ لگتی تھی اور سننے والا تڑپ جاتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی شاعر کی زبان سے ایسے بھی اشعار سننے میں آجاتے تھے، جو انسان کے ذہن و دماغ کو متاثر کرنے والے ہوتے تھے۔ لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، پھر اردو شاعری پر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ ہجر کے مصائب، وصل کے خواہشات، دنیا سے بیزاری فلک کی جفاکاری، زمانہ کی غداری کی ترجمان بن گئی، حسن و عشق کے معاملات کی تصویر کشی، اور چوما چاٹی اور نوچا کھسوٹی کی داستانوں کا بیان، حسن شاعری سمجھا جانے لگا۔ سودا نے ہجو گوئی کا دروازہ کھولا، انشا اور مصحفی نے اس کو معراج کمال تک پہنچایا۔ اسی دور میں ریختی نے دنیائے شاعری میں سر ابھارا۔ سعادت یار خاں رنگین ریختی کے موجد کی تہمت سے متہم ہوئے۔ اس طرح شاعری اپنے منصب سے گرنے لگی، مگر اردو شاعری کے لئے یہ دور ایک عبوری دور تھا۔ اس عبوری دور کے خاتمے کے آثار تو آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نظر آنے لگے تھے، لیکن اس آخری شمع کے گل ہوتے ہی اس کا مزاج بدلا۔ اب نہ کوئی دکان تھی نہ کوئی خریدار، جنس کی فروانی حسن نظری کی متلاشی تھی۔ حسن نظری محلوں سے کھنڈرات میں منتقل ہو چکا تھا اور اس پر عوام کا قبضہ تھا۔

صاحب احساس شعرا نے اس کو محسوس کیا، قدیم شاعری نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ جدت فکر نے، تخیل کی بلندی نے، بیان کی شوخی نے، اور انداز بیان کے بانکپن نے اس کے جسد مردہ میں دوبارہ جان ڈالی اور زمانے کے ساتھ اردو شاعری کا مزاج بھی بدلنے لگا اور ایک بار پھر اردو شاعری جو عوام کو چھوڑ کر دربار دلی سے وابستہ ہو گئی تھی اور جس نے امرا کے عادات و انداز قبول کر لئے تھے اور ان کی زندگی کو بنا سنوار کر پیش کرنے لگی تھی، عوام میں آگئی اور عوام کے دکھ درد کے، رفت تیار کرنے لگی۔ اردو شاعری کو اس منزل پر لانے والے مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ حالی نے صرف شاعری کا رخ ہی نہیں بدلا، بلکہ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اس کا دائرۂ عمل اپنی وسعتوں کے اعتبار سے زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ حالی کا اردو شاعری پر یہ احسان ناقابل فراموش احسان ہے۔

انھیں حقیقت پسندوں میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، شمس العلما مولانا ڈپٹی نذیر احمد بھی تھے جن کو صرف حالی کے معاصر ہونے کا شرف حاصل نہ تھا بلکہ ان مشاہیر نے حالی کی پیروی بھی کی تھی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد اس دعوت میں اس طرح قبول عام کا شرف حاصل کیا کہ ان کے مخالفوں نے بھی وہی راہ اختیار کرنا شروع کر دی

سلیم پانی پتی، جوالا پرشاد برق، نوبت رائے نظر، برج نرائن چکبست بھی اسی شاہ راہ پر چل نکلے۔ مگر اس راہ کا کامیاب مسافر منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی تھا۔

سرور کا آبائی وطن قصبہ جہاں آباد، ضلع پیلی بھیت تھا۔ آپ کے والد حکیم پیارے لال ایک کامیاب طبیب تھے۔ آپ سنہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو کی تعلیم جہاں آباد کے اُردو اسکول میں حاصل کی، فارسی اپنے والد سے پڑھی انگریزی بھی نجی طور پر پڑھی۔ فن طب میں مہارت تامہ حاصل کی اور دِق کے مریضوں کا کامیابی سے علاج کرنے لگے۔ مگر سرور اس لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے کہ وہ خطمی اور بنفشہ کے چکر میں پڑتے اور نبض اور قارورہ پر اپنا وقت صرف کرتے بلکہ ان کی پیدائش کا مقصد، زبان و ادب کی خدمت کرنا۔ اس کو بڑھانا اور سنوارنا تھا، اور آنے والی نسلوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولنا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ سرور نے اس مقصد کو کہاں تک پورا کیا

یہ بات تو ادب کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں کہ سرور پیدائشی شاعر تھے۔ اور ان کے گھر کا ماحول علمی ماحول تھا، پھر وہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کی مادری زبان اردو تھی اور دوسری زبان فارسی، فارسی ادب کا مزاج حسن و عشق کا مزاج تھا۔ مگر تصوف کی چاشنی نے اس کو مجاز سے حقیقت کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ حقیقت سرور کی میراث تھی۔ اور اس حقیقت کا اثر سرور کی زندگی پر اس طرح پڑا کہ سرور خود حقیقتوں کے آئینہ دار بن گئے۔

پھر ان باتوں کا تعلق شاعرانہ تعلّی سے نہیں بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور سرور کا کلام ان حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔

سرور کی شاعری کے بظاہر دو دور ہیں۔ ایک وہ دور جس کا تعلق ان کی طالب علمانہ زندگی سے تھا، اور دوسرا، وہ دور جب کہ ان کی زندگی الم ناکیوں کا عبرت خیز مرقع بن چکی تھی۔

سرور نے کل ۳۷ سال کی عمر پائی اور ان کی شعری زندگی کا آغاز تیرہ سال کی عمر میں ہوا۔ اس طرح دنیائے شاعری میں انھوں نے کل ۲۴ سال گزارے۔ زندگی کے یہ چوبیس سال اپنے اندر غم والم کا اتنا بڑا ذخیرہ چھپائے ہوئے ہیں کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن سرور کا کلام خود ایک مجسم کتاب ہے جس میں سرور کی زندگی کے صبح و شام دیکھے جا سکتے ہیں، اس کتاب زندگی میں ایک سو پینتیس ایسے عنوان ہیں جو سرور کی زندگی کو پیش کرنے کے لئے کافی ہیں، ان عنوانات میں حسین قہقہے اور دلفریب مسکراہٹیں تو مفقود ہیں لیکن مصوری اور منظر کشی کے کچھ نمونے ضرور مل جاتے ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ نینوں سے بہتی ہوئی گنگا جمنا ہے، اضطراب کی چیخیں ہیں، وطن کی بربادی اور غلامی کا احساس ہے اور عظمت رفتہ کی تباہی کا ماتم ہے، اور مشاہیر ملک سے بچھڑنے کا غم ہے۔

مصوری اور منظر کشی کے نادر نمونے پریاگ کا سنگم "جمنا جی" "گنگا جی" اور "نسیم سحر" ہیں۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب دیکھنے کے لئے "اندھی پھول والی" "قید ہستی" "حسرت دیدار" "بدنصیب بنگال" اور "دل بیقرار سو جا" کا دیکھنا ضروری ہے۔

"دل بے قرار سو جا" بظاہر ایک لوری ہے لیکن اپنے پس منظر کے آئینہ میں وہ لوری دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی لوری ہے اور یہ لوری سرور نے ایک ایسے عالم میں لکھی ہے کہ جب صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا اور سرور خود غم حیات سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے چین نظر آتے تھے۔

سرور کی زندگی کا یہ المیہ کون کم تھا کہ رفیق زندگی نے عین عالم شباب میں ساتھ چھوڑ دیا اور رفاقت کی نشانی سرور کی آغوش میں ڈال دی۔ سرور نے اس نشانی کو سینے سے لگایا لیکن انھیں یہ بات کب معلوم تھی کہ جب یہ نشانی اپنی زندگی کے دو سال پورے کرے گی تو دست اجل کے ہاتھوں ہم سے ہمیشہ کے لئے چھن جائے گی۔ مگر اس وقت کا آنا ضرور تھا۔ وہ وقت آیا اور موت کا ہاتھ اس

محبت و رفاقت کی قابلِ یادگار نشانی کو بے کر چلا گیا۔

بیوی کی موت نے زندگی میں ایک خلا پیدا کیا تھا۔ بچی کی موت نے دنیا بھی اندھیری کر دی۔ بیوی کے غم میں جو آنسو نکلے تھے انہوں نے "حسرت دیدار" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سرور نے وہ تمام آنسو بارگاہ "ممتاز" میں پیش کر دئے تھے اور "شاہ جہاں" کی زبان میں پکار اُٹھے تھے کہ:۔

پہلو میں میرے آجا اے جانِ جہاں کہاں ہے　　تکتا ہوں راہ تیری، آنکھوں میں میری جاں ہے
کس خواب ناز میں ہے، آنکھوں سے کیوں نہاں ہے　　تاریک تیرے غم سے، نظروں میں اک جہاں ہے
افسوس مرتے دم تو، ارماں نظر کا نکلے　　سینے پہ ہاتھ رکھ دے، کانٹا جگر کا نکلے
اے کاش تجھ سے ہنس کر میں ہم کلام ہوتا　　"روضہ" میں ساتھ تیرے محوِ خرام ہوتا
ہوتا کنارِ جمنا اور وقتِ شام ہوتا　　اور چاند آسماں پر بالائے بام ہوتا
تو مجھ کو پیار کرتی میں تجھ کو پیار کرتا　　قدموں پہ جانِ شیریں تیرے نثار کرتا
اے کاش تیری الفت دل چیر کر دکھاتا　　چھلنی ہے سوجگہ سے تجھ کو جگر دکھاتا
منظر جو یاس کا ہے پیشِ نظر دکھاتا　　نیرنگِ آسمانِ بیداد گر دکھاتا
جنت میں روح تیری، ہے آہ، کیا کہوں میں　　تو خوابِ ناز میں ہے، قیدِ جفا میں ہوں میں

لیکن بچی کے انتقال کا حادثہ ایک ایسا حادثہ تھا کہ جس کو بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ دن میں تو سرور نے کسی نہ کسی طرح اپنا غم غلط کیا، مگر رات میں جب لوری دے کر بچی کو سلانے کا ارادہ کیا اور بستر کو خالی پایا تو دل تڑپ ہی گیا۔ اسی تڑپ کے عالم میں سرور کی زبان پکار اُٹھی کہ:۔

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا　　کہ گزر گئی شب آدھی دل بیقرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے　　تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے　　مرے پردہ دار سو جا، مرے رازدار سو جا
ابھی دھان پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل　　یہ تپش کا آہ شیوا نہ کر اختیار سو جا
مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دم بدم تڑپنا　　ترے غم میں آہ کب سے میں ہوں اشکبار سو جا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں　　تجھے سینے سے لگا لوں، تجھے کر لوں پیار سو جا
تجھے جن کا ہے تصور اے مست جام الفت　　انھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا
تجھے پہلا سابقہ ہے، شب غم بُری بلا ہے　　کہیں مر مٹے نہ ظالم، دل بے قرار سو جا

مگر اس تمام آہ و فغاں اور رنج و غم کا تعلق سرور کی ذات سے تھا۔ سرور نے اس غم کو غم جاوداں بنانے کی کوشش کی۔ اسی لئے اس کے اظہار کیلئے جو انداز اختیار کیا وہ زمانے سے نرالا انداز تھا۔ ان کو جو غم کھائے جا رہا تھا وہ وطن کی غلامی کا غم تھا۔ وطن سے اور وطن کے ذرّے ذرّے سے محبت ان کا ایمان تھا اور وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کو وہ تکمیل ایمان کا ذریعہ جانتے تھے۔ وطن کا، وطن کے حسن و جمال اور وطن کے خداداد سرمایہ کا تعارف ان کی زندگی کا مقدس مشن تھا۔ ان کے اس مشن اور نظریات کو سمجھنے کے لئے ان کے کلام کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

کیونکہ نظیر اکبرآبادی کے بعد سرور جہاں آبادی تاریخ ادب اردو کی روشنی میں پہلے شاعر ہیں کہ جنھوں نے اردو شاعری میں ایرانی تصورات کے قبول کرنے سے عملاً اجتناب کیا تھا۔ ان کے نزدیک لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی داستان حسن و عشق سے زیادہ دلفریب داستان "نل دمن" کی داستان تھی، "شمع و پروانہ" "جگنو و مرغابی" "بھنورا" "کوئل" "مرغابی" "سارس" "بیر بہوٹی" "ہندوستان کے انمول رتن ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا، ہندوستان کا مذاق ہے۔ سرور نے ان میں سے ہر ایک کو لیا ہے اور ادب میں ایک مناسب جگہ دلوانے کی کوشش کی ہے۔ گنگا جمنا تو ان کے بہترین شاہکار ہیں۔ "پدمنی کی چتا" "نور جہاں کا مزار" "سوز بیوگی" اور "اجڑی ہوئی دلہن" میں ان کے دل کی دھڑکنیں محسوس کی جا سکتی ہے اور ان کے مزاج زندگی اور جذبہ حب الوطنی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس جذبہ حب الوطنی کا اندازہ لگانے کے لئے "عروس حبِّ وطن" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

آ، اے عروس حبِّ وطن، میرے بر میں تو   آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو
آ، اے نگار تجھ کو گلے سے لگاؤں میں   آ، مجھ سے ہم کنار ہو اے شوخ خوش گلو
ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو   آ، اے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو
وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو   وہ دل ہو داغ، جس میں نہ ہو تیری آرزو
حوروں میں مر کے تو جہنم نصیب ہو   کافر ہوں میں جو مجھ کو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں   اس کے لئے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہلائے شیخ اگر تیرا حکم ہو   تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو
تیرا طریق عشق ہی ایمان ہے مرا   تیرے فدائیوں میں ہوں اے شیخ خوبرو
جلوہ نہ ہو کسی حسن رعنا کے سامنے   وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

"عروس حب وطن" کے اس تعارف کے بعد، "سرزمین وطن" کا تعارف بھی پڑھ لیجئے۔

آہ، او عفت کی دیوی، او وطن کی سرزمیں   آسماں کی او پری فردوس کی لے حور عیں
تھی چمن آرائے گیتی تیرے گلشن کی بہار   بھینی بھینی آہ وہ موج نسیم عنبریں
تیری شاخوں کا لچکنا آہ وہ مستانہ وار   جھومتی ہو نشہ میں جیسے کوئی ناز آفریں
پیاری پیاری آہ کوئل کی سریلی وہ صدا   جیسے گائے زہرہ وش کوئی لب جو بیٹھ کر دیں
سبزہ زاروں میں وہ ٹھنڈی ٹھنڈی نکھری چاندنی   آبشاروں میں وہ شب کو پرتو ماہ مبیں
وہ تبسم برق کا اور کالی کالی وہ گھٹا   لیلی وش اک نازنیں اک گلبدن خندہ جبیں
وہ کسی کی کم سنی کی ننھی کلیوں میں ادا   بھینی بھینی ان میں نکہت شاہد پردہ نشیں
تجھ میں رعنائی تھی کیا کیا او وطن کی سرزمیں   شان محبوبی تھی کیا کیا او، وطن کی سرزمیں

لیکن "سرزمین وطن" کا یہ تعارف اس ماضی کا تعارف تھا، ماضی کا ہندوستان اس میں کوئی شک نہیں، ایسا ہی ہندوستان تھا انقلاب و حوادث کی نیرنگیوں کی بدولت اس نے جو شکل اختیار کر لی تھی اس کا نظر انداز کرنا ایک حساس شاعر کے لئے بہت مشکل تھا پھر سرور جیسا حساس شاعر۔ سرور نے حال کی الم ناکیوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

ہائے وہ دلکش نگر تیرے مناظر اب کہاں   اب کہاں وہ شاہد قدرت کی بزم آرائیاں

جھوم کر چلتی ہے اب بھی تیرے گلشن میں نسیم
لیکن اگلی سی کہاں وہ چال میں اٹھکھیلیاں

روح افزا، آہ کتنے تھے وہ ایام بہار
بوئے گل سے جب معطر تھا مشام شوق جاں

تیری کشت آرزو کا ہے خدا حافظ کہ اب
گرم جولاں برق ہے ابرِ سیہ ژالہ فشاں

تو وہ تنقید جگر ہے، آہ او خاک وطن
سو شرارِ آرزو ہیں راکھ میں تیرے نہاں

اب کہاں تیروں کے پیکاں دل میں چبھتے ہوئے
رہ گئی کہنے کو اب باقی ہے، جن کی داستاں

جوشش غم سے ہے اب زیر و زبر خوں نابہ ریز
کہہ رہی ہے رو کے یہ دانا کی تیغ دو زباں

اے وطن کی سرزمیں تصویر عبرت اب ہے تو
صفحہ ہستی پہ یعنی نقشِ حسرت اب ہے تو

پھر یہی حقیقت "خاک وطن" کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ سرور کی یہ نظم ایک بلند پایہ نظم ہے۔ اس نظم کا ایک ایک مصرعہ سوز و گداز کا آئینہ دار ہے اس طویل نظم کا آغاز:۔

آہ اے خاکِ وطن اے سرمۂ نورِ نظر
آہ اے سرمایۂ آسائشِ جان و جگر

سے ہوتا ہے۔ اس نظم کو ختم کرتے ہوئے سرور کہتے ہیں:۔

آہ اے خاک وطن اے درد مند بے قرار
آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار

اُڑ رہا تھا پرچم شوکت ترا افلاک پر
سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

تیری شہرت کے نگیں خاکِ عدم میں ہیں نہاں
اب نہ وہ تخت مرصع ہے نہ تاج زرفشاں

جھلملا کے بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ
ہیں جگر کے داغ اب تیرے شبستاں کے چراغ

اُڑ گیا نور سحر، تاریکیٔ غم چھا گئی
نیر اقبال ڈوبا شامِ ماتم چھا گئی

اُڑ گئی بوئے وفا حُبِ وطن جاتی رہی
چھا گیا رنگ خزاں شان چمن جاتی رہی

اب کہاں ایثارِ نفس احباب وہ جانبازی کہاں
حسرتیں خوں گشتہ ہیں کچھ دل کی بستی میں نہاں

پھر بھی اے خاک وطن اف ری وفاداری تری
چار سو ہے دہر میں نہرِ کرم جاری تری

تیرے جنگل اب بھی ہیں خاک وطن مہماں نواز
تیرے پتے میں ہے قدرت کی ادائے دل نواز

مندرجہ بالا نظم سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سرور کی دور رس نگاہیں حال پر نہیں بلکہ اس کے مستقبل پر تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس آزاد ہندوستان میں اگر کسی چیز کا فقدان ہے، تو وہ وطن کی محبت، ایثار نفس، جانبازی اور وفاداری کا فقدان ہے۔ اگر یہ کمی آج کے ہندوستان میں پوری ہو جائے، تو پھر ہندوستان ماضی کا ہندوستان بن سکتا ہے۔ مگر اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندستانیوں کا باہمی اتحاد ضروری ہے۔ یہ اتحاد آگ اور پانی کا اتحاد نہیں، بلکہ "نرم و گرم فریق" کا اتحاد ہے، یہ دونوں فریق مذاہب کی پیداوار نہیں، اسی لئے ان کو مذاہب کی جکڑ بندیوں میں جکڑا بھی نہیں جا سکتا۔ اور نہ ان کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جو نام استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ سیاسی بازی گروں کے رکھے ہوئے نام ہیں جو انھوں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے رکھ دئے تھے۔ ورنہ مذاہب عالم انسانیت کے اتحاد کے علمبردار ہیں۔ سرور نے اسی لئے اس افتراق کو مذاہب کے سر نہیں منڈھا بلکہ ہندوستان کے رہنے والوں کو "نرم گرم فریق" کے ناموں سے بانٹ کر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

فخر وطن ہیں دونوں، اور دونوں مقتدر ہیں
ہیں پھول اک چمن کے، اک نخل کے ثمر ہیں

اے قوم تیرے دکھ کے دونوں ہی چارہ گر ہیں
دونوں جگر جگر ہیں، لیکن دگر دگر ہیں

آپس کے تفرقوں سے ہیں آہ خوار دونوں
اغیار کی نظر میں ہیں بے وقار دونوں

مل کر چلو کہ آخر دونوں ہیں بھائی بھائی
بھائی سے کیا لڑائی، بھائی سے کیا برائی

کب تک یہ خانہ جنگی، کب تک یہ خود ستائی
زیبا نہیں بڑوں کو ہندار خود نمائی

مل کر گلے نکالو، دل کے غبار دونوں
اک خاک کے ہو پتلے پایانِ کار دونوں

تاچند یہ فسانے غم ہائے متصل کے
غیروں کو کیا دکھاتے ہو داغ اپنے دل کے

آئے ہوئے ہیں پہلو میں آہ زخم چھل کے
ہو جائے پار کشتی کوشش کرو جو مل کے

برپا ہے شورِ طوفاں، ہو، ہوشیار دونوں
کردو بھنور سے قومی بیڑے کو پار دونوں

رشکِ جناں بناؤ ہندوستان کو مل کر
خونِ جگر سے سینچو اس گلستاں کو مل کر

لہراؤ آسماں پر قومی نشاں کو مل کر
دو آب جاں نثاری نوکِ سناں کو مل کر

میدان جدّ و جہد کے ہیں شہسوار دونوں
حُبِّ وطن پہ کردو، دل کو نثار دونوں

لیکن اگر کوئی" نرم و گرم فریق" کو نام ہی دینے کے لئے بے چین ہو اور وہ اسے مسلمان اور ہندو کے نام سے پکارنا چاہتا ہو، تو پکارے اور ضرور پکارے مگر سرور کا تصور متحدہ قومیت کا تصور تھا، وہ ہندوستان کے تمام رہنے والوں کو ایک قوم سمجھتے تھے اور اسی لئے ہندوستانیوں کی خوشی ان کی خوشی، غم ان کا غم تھا۔ اگر لالہ بال مکند گپتا اور سوامی رام تیرتھ کے انتقال پر ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں تو نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزادؔ کے وفات کی خبر بھی ان کو بے چین کر دیتی ہے اور دونوں کے انتقال کو وہ قومی حادثہ قرار دیتے ہیں اور جو نوحے لکھتے ہیں، وہ زبان قلم سے نہیں بلکہ خون جگر سے لکھتے ہیں ان نوحوں کے علاوہ ان کے مجموعۂ کلام

میں دردو اثر میں ڈوبے ہوئے نہیں معلوم کتنے نوحے اور مرثیے ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر تیر و نشتر سے کم نہیں "شیون عروس" "شیون داغ" "بادِ پروانہ" "ماتم آرزو" "گل مزار" "دنیا کی اُجڑی ہوئی محفل" کے زیرِ عنوان سرور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں درد و کرب کی بیشمار چیخیں، اضطراب و الم کی پکاریں، سوزش و تپش کی بے قراریاں پوشیدہ ہیں اور پھر وہ چیخیں عیش و نشاط کو مکدر کر دینے والی اور عشرت کدوں کو ماتم کدہ بنا دینے والی ہیں۔ اگر ہم ان چیخوں کو نہیں سننا چاہتے تو نہ سنیں پھر بھی "شیون عروس" پر ایک نظر ڈال لئے ہی جائیں۔ جس میں دلی کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کے عروج رفتہ کی دلدوز داستان کے ساتھ اردو زبان کا ماتم کیا گیا ہے سرور "عروس" کا تعارف کراتے ہوئے "عروس کی زبان میں کہتے ہیں:-

یادگارِ عز و شانِ دولتِ اسلامیہ
دلی والی ہوں میں اردوئے معلیٰ کی دلہن

شاہزادی تھی کبھی دلی کی میں او بے خبر!
میرے سر پر چتر شاہی تھا کبھی سایہ فگن

پھر کہا اس شعلہ رو نے یوں بصد سوز و گداز
شمعِ محفل جس کی تھی میں، اُٹھ گئی وہ انجمن

خانہ ویرانی برستی ہے در و دیوار پر
نقش عبرت اب ہیں آثارِ صنا دیدِ کہن

میں کہاں دلی کی اب وہ پر فضا کلیاں کہاں
ہائے وہ قصرِ مرصع اور ایوانِ کہن

مٹ گئے سب رفتہ رفتہ میری عظمت کے نشان
رہ گیا باقی فقط افسانۂ رنج و محن

پھر یہ شیون دس بیس اشعار پر ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ "شیون عروس" اڑسٹھ ۶۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور رنگ سخن ظاہر ہے اسی طرح داغ کا نوحہ بھی سرور کا ایک شاہکار ہے اس نوحے کے بیس بند ہیں جو بہ طرز مسدس لکھا گیا ہے۔ چند ہی بند بطور نمونے کے نقل کئے جا سکتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ اے نظم تیرا عشوۂ دل جو کدھر گیا — سر چڑھ کے بولتا تھا وہ جادو کدھر گیا
شانہ وہ کیا ہوا، خم گیسو کدھر گیا — چوٹی کا پھول داغ سمن بو کدھر گیا
کلیاں کدھر گئیں تیری دامان ناز کی
بو بھینی بھینی کیا ہوئی زلفِ دراز کی

۲۔ یہ کس کے ساتھ رونق بزم سخن گئی — سنبل کے پیچ، تازگی یاسمن گئی
کلیوں کی شان پھولوں کی دلکش پھبن گئی — رعنائی عروس بہار چمن گئی
وہ ایشیا کا آہ چمن زار کیا ہوا
پھولوں کا پھول "داغ" وفادار کیا ہوا

مضمون حسن و عشق کے اوتر جہاں چہک
بزم سخن میں داغ فصیح البیاں چہک
اے ہم صفیر طوطیٔ خلد آشیاں چہک
مطلع پہ اپنے بلبل ہندوستاں چہک

کس نے کہا کہ 'داغ' وفادار مر گیا
وہ ہاتھ ملکے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

اردو کے باغ میں گل رنگیں ادا تھا ایک
سارے چمن میں بلبل رنگیں نوا تھا ایک
داغوں میں داغِ عشق کا لذت فضا تھا ایک
تاج سخنوری میں دُرِ بے بہا تھا ایک

بن کر وہ چشم دہر سے آنسو ٹپک گیا
اے دل ٹپک کہ داغ وفا جو ٹپک گیا

لالہ بیں ہے کہ ہے مہِ کامل ہیں داغ تو
ہے کس کی بزم ناز کا آخر چراغ تو
چھلکا پیے سخن کے نہ بھر کر ایاغ تو
او آسماں بہت نہ دکھا سبز باغ تو

اے صرصر زمانہ نہ داغوں پہ داغ دے
جو بجھ گئے وہ بزم سخن کے چراغ دے

اور وہ چراغ حضرت امیر مینائیؒ اور حضرت داغ مرحوم تھے اسی لئے نوحہ کو ختم کرتے ہوئے سرور کہتے ہیں۔

داغ و امیرؔ کے لب اظہار بھیجدے
نطقِ فصیح و شوخی گفتار بھیج دے
تاج سخن کے گوہر شہسوار بھیجدے
منگواتی ہے نظام کی سرکار بھیجدے

ان موتیوں کو خاک دکن کیا کرے گی تو
کس پر نثار یہ دُر یکتا کرے گی تو

سوتے ہیں ایک برج میں زیر مزار حیف
دو مہر و ماہ اوج سخن کے ہزار حیف
وہ خاک میں نہاں ہیں در آبدار حیف
گلگوں کفن ہیں دو گل رنگیں بہار حیف

دہلی کا ایک پھول ہے، اک لکھنؤ کا پھول
لالہ کا ایک پھول ہے، اک ناز بو کا پھول

پھر سرور نے صرف ان ہی نوحوں اور مرثیوں میں اپنے وسیع النظری اور فراخ حوصلگی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ بلکہ ان کی پوری زندگی انھیں حقائق کی آئینہ دار تھی۔ اس کے ثبوت میں ان کی وہ نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں جو انھوں نے پیشوایان مذاہب کے حضور میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر لکھی ہیں۔ انھیں نظموں میں ایک نظم پیغمبر اسلام کی شان اقدس میں بھی ہے جس کا عنوان ہے "آجا"۔ یہ عنوان خود ہی جذبۂ عقیدت و محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں کیا عرض کیا ہے تو اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ لیکن ان نظموں کے آئینہ میں سرور کا جو حسین عکس نظر آتا ہے اس کے دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ سرور اپنے وقت کا ایک عظیم شاعر تھا۔ تاریخ ادب اردو میں اس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا اور بقائے دوام کی سند حاصل کرنے کے لئے اس کا کلام کافی ہے...... سرور نے ۳۷ سال کی عمر میں ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو ہنستے کھیلتے ہوئے جان دیدی۔ حضرت شوکت بلگرامی انتقال کی خبر سن کر پکار اٹھے "سرور رحلت کرد" ۱۳۲۸ھ اور برق کو کہنا پڑا کہ

نقش باطل ہو نہیں سکتا کبھی نام سرور
دہر میں جب تک رہے گی گردش جام سرور

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

باب المراسلہ والمناظرہ

برق لامع اور غالب

آغا افتخار حسین صاحب۔ سنٹرل پبلک سروس کمیشن (کراچی)

مکرمی و محترمی۔ سلام علیکم۔

اکتوبر کے نگار میں باب الاستفسار کے ذیل میں "برق لامع" سے متعلق نگار کا جواب نظر سے گزرا۔ جواب میں بعض باتیں خلافِ واقعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے مندرجہ ذیل معروضات پیشِ خدمت ہیں:۔

(۱) "برق لامع" کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں نہیں بلکہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ اس کا کیٹلاگ نمبر ۲ ہے۔ ملاحظہ ہو بلوم ہارٹ کا انڈیا آفس کے ہندوستانی مخطوطات کا کیٹلاگ۔ مطبوعہ ۱۹۲۶ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ ۳۔

(۲) "برق لامع" کا مصنف غالب (اسد اللہ خاں یا کوئی دوسرا) نہیں بلکہ مرزا جعفر فصیح ہے۔ بلوم ہارٹ نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ فصیح کا ذکر نساخ نے اپنے تذکرہ "سخنِ شعراء" میں کیا ہے۔ فصیح مرزا ہادی لکھنوی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔

(۳) غالباً یہ کہنا تصحیح طلب ہے کہ اس مثنوی میں مصنف نے اثنا عشری مذہب کی تعلیمات نظم کی ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے اس میں ان اعتراضات کا شیعی نقطۂ نظر سے جواب دیا گیا ہے جو "سیف قاطع" میں شیعہ فرقے پر کیے گئے تھے۔ "برق لامع" کے متن میں ہر اعتراض کا علیحدہ علیحدہ جواب دیا گیا ہے۔ پہلے "سیف قاطع" کے وہ اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں اعتراض کیا گیا ہے۔ اور پھر ان کا جواب اسی بحر میں دیا گیا ہے۔ ہر اعتراض کا جواب اسی ترتیب سے فرداً فرداً دیا گیا ہے۔

(۴) یہ مثنوی فارسی میں نہیں بلکہ اُردو میں ہے۔ پہلا شعر (فارسی) نگار نے نقل کیا ہے۔ دوسرا شعر یہ ہے!

زبانِ خامہ ہوتی ہے گہر بار
رقم کرتا ہوں مدح آلِ اطہار

(۵) اس کتاب کا ایک مخطوطہ میں نے آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں بھی دیکھا ہے۔

(نگار) آپ کا یہ ارشاد کہ برق لامع کا نسخہ برٹش میوزیم میں نہیں ہے نادرست ہے ۔۔۔۔ برٹش میوزیم کے ہندوستانی کیٹلاگ مرتبہ بلوم ہارٹ (مطبوعہ ۱۸۹۹ء) کے صفحہ ۲۰۴ پر اس کتاب کا ذکر موجود ہے۔ ا۔

آپ کا دوسرا اعتراض کہ اس کا مصنف نہ اسد اللہ خاں غالب تھا اور نہ کوئی اور غالب، ممکن ہے صحیح ہو لیکن جس کیٹلاگ کا حوالہ میں نے دیا ہے اس میں یہی لکھا ہے کہ "اس کا مصنف کوئی شاعر المتخلص بہ غالب تھا"۔

آپ نے انڈیا آفس لائبریری کے جس کیٹلاگ کا ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے اور اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۳۰ھ میں لکھی گئی جیسا کہ اس کے تاریخی نام خورشید طالع سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن کتاب کے اخیر میں جو شعر درج ہے اس سے ۱۲۳۱ھ نکلتا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ تاریخ اختتام کتاب کی ہو اور خورشید طالع آغاز تصنیف کی تاریخ۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کی فہرست مخطوطات مرتبہ براؤن میں بھی اس کتاب کا ذکر موجود ہے۔ لیکن مصنف کا نہیں۔ خیر یہ تو کوئی بات نہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے سنہ تصنیف ۹۸۳ھ ظاہر کیا ہے اور ثبوت میں ایک فقرہ درج کیا ہے جس سے تاریخ تصنیف واقعی ۹۸۳ھ نکلتی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے اصل مصرع ۔۔۔۔۔۔ میں سے صرف ایک ٹکڑا لے لیا اور دوسرا ٹکڑا چھوڑ دیا۔

بہر حال براؤن نے ۹۸۳ھ کی تعیین بالکل غلط کی ہے اور اس کتاب کی تصنیف کا آغاز یقیناً ۱۲۳۰ھ میں ہوا اور اختتام ۱۲۳۱ھ میں، جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں۔

اس کا مصنف جیسا کہ انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ (مرتبہ بلوم ہارٹ) میں درج ہے۔ غالباً مرزا جعفر فصیح ہی تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں بلوم ہارٹ نے کیوں یہ لکھا کہ اس کا مصنف کوئی شاعر غالب تخلص کا تھا۔

ایک جگہ وہ اسے فصیح سے منسوب کرتا ہے اور دوسری جگہ غالب سے، یہ کیا معمہ ہے۔ زرا اس پر بھی غور فرمائیں۔

آکسفورڈ کیٹلاگ میری دسترس سے باہر ہے۔ ممکن ہو تو آپ اسے بھی دیکھ لیجئے شاید اس میں کچھ اور صراحت موجود ہو۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ میرے محترم دوست مولانا محمد باقر شمس تشریف لائے اور انہوں نے اس کتاب کے متعلق یہ معلومات فراہم کیں کہ یہ مثنوی ہے مرزا جعفر علی فصیح کی۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے شیعوں کے خلاف کسی نے ایک کتاب قبقاب لکھی تھی جس میں مناظرہ کم اور گالیاں زیادہ تھیں۔ اس کا ایک جواب لکھنؤ کے مشہور ظریف اور ہجو گو شاعر میاں مشیر نے کفش کتاب کے نام سے لکھا تھا اور دوسرا جواب مرزا جعفر علی فصیح نے لکھا جو اپنے زمانہ کے بلند پایہ شاعر تھے اور مرثیہ گو بھی۔

برق لامع چھپ چکی ہے اور لکھنؤ میں اکثر لوگوں کے پاس موجود ہے۔

باب الاستفسار

(۱)

سعدی کی تاریخ پیدائش و وفات

(سید اختر علی صاحب جگن پور)

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مصلح الدین سعدی شیرازی مصنف گلستان و بوستان، کس سنہ میں پیدا ہوئے اور کب ان کی وفات ہوئی۔ اسی طرح حافظ کا سن وفات بھی مطلوب ہے۔

(**نگار**) سب سے پہلے تو میں یہ بتا دوں کہ آپ نے سعدی کا نام مصلح الدین صحیح نہیں لکھا۔ یہ نام ان کے باپ کا تھا خود ان کا نام شرف الدین تھا۔ قدیم مخطوطات میں ان کا نام "مشرف بن مصلح السعدی" - "مشرف الدین بن مصلح" - یا "مشرف اللہ والحق والدین مصلح الاسلام" درج ہے۔ نفحات الانس میں مولانا جامی نے ان کا نام "شرف الدین مصلح لکھا ہے۔ تاریخ گزیدہ میں البتہ اس کو الٹ کر "مصلح بن مشرف" لکھا ہے اور غالباً اسی کے بعد وہ مصلح الدین کے نام سے مشہور ہو گئے

سعدی کی صحیح تاریخ پیدائش کا حال معلوم نہیں۔ لیکن بوستان کی تصنیف کے وقت جو سنہ ۶۵۵ھ کی تصنیف ہے، اپنی عمر وہ ستر سال کی ظاہر کرتے ہیں۔

بیا اے کہ عمرت بہ ہفتاد رفت
مگر خفتہ بودی کہ بر باد رفت

اور اس حساب سے ان کا سن ولادت سنہ ۵۸۵ھ ہونا چاہئے لیکن گلستان میں ایک جگہ انھوں نے۔ شیخ شمس الدین ابوالفرج بن جوزی" کو اپنے عہد شباب کا معلم ناصح ظاہر کیا ہے اور اگر یہ وہی ابن جوزی ہیں جو "جمال الدین ابن الفرج ابن الجوزی" کے نام سے مشہور ہیں تو پھر سعدی کا سن ولادت سنہ ۵۸۵ھ سے کچھ زمانہ قبل کا ماننا پڑے گا۔

سعدی کی وفات ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۶۹۰ھ میں ہوئی ہے یا حسب بیان دولت شاہ و مولانا جامی سنہ ۶۹۱ھ میں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ سعدی کی عمر اسوقت ۱۰۲ سال کی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سعدی سنہ ۵۸۹ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن رازی نے وفات کے وقت ان کی عمر ۱۱۰ سال ظاہر کی ہے اور اسی حساب سے سن ولادت سنہ ۵۸۰ھ قرار پاتا ہے۔ بہر حال سعدی سنہ ۵۸۰ھ اور سنہ ۵۸۹ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن زیادہ قابل وثوق سنہ ۵۸۹ھ ہے جس کی تصدیق خود سعدی کے متذکرۂ بالا شعر سے ہوتی ہے

گل اندام نے جو حافظ کا دوست اور کلام حافظ کا جامع بھی تھا۔ سن وفات سنہ ۷۹۱ھ ظاہر کیا ہے۔ حافظ کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس میں بھی یہی تاریخ درج ہے جو خاک مصلی کے اعداد سے نکلتی ہے۔

ملاحظہ ہو دیباچۂ کلیات کا یہ شعر :-

چو در خاک مصلیٰ ساخت منزل
بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

صاحب لب التواریخ اور تقی کاشی نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ لیکن بعض نسخوں کے دیباچہ میں یہ قطعہ درج ہے :-

بسال باو صاد ذال ابجد — ز روز ہجرت میموں محمد
بسوئے جنت اعلیٰ رواں شد — فرید عہد شمس الدین محمد

جس سے تاریخ وفات ۷۹۲ھ نکلتی ہے اور جامی نے بھی نفحات الانس میں یہی تاریخ ظاہر کی ہے۔ دولت شاہ نے ۷۹۴ھ ظاہر کی ہے جو صحیح نہیں۔ اسی کے ساتھ دولت شاہ نے یہ بھی صحیح نہیں لکھا کہ شاہ منصور کی وفات (۷۹۲ھ) کے کے بعد، حافظ و تیمور کی ملاقات ہوئی۔

---

(۲)

ایران ——— پارسی

(عبد الغفور خال۔ ایبٹ آباد)

مملکت ایران کو ایران کیوں کہتے ہیں کہ کیا اس کا تعلق آریہ قوم سے ہے جس کے بعض افراد ہندوستان آگئے اور بعض ایران میں رہ گئے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر وہاں کی زبان کو صرف ایرانی کہنا چاہئے۔ فارسی کیوں کہتے ہیں؟

(نگار) ایران کی قدیم تاریخوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران دراصل نام تھا ہوشنگ بن سیامک کا اور یہ سرزمین اسی کے نام سے موسوم ہے رہا سوال پارسی کا سو اس کی صورت بھی یہی ہے کہ جب ہوشنگ کے بعد اس کا بیٹا پارس تخت نشین ہوا تو وہاں کی زبان کو پارسی کہنے لگے۔ اوستا کا۔ ایران۔ آیران۔ ایریانا اور سنسکرت کا آریہ سب ایک ہی چیزیں ہیں۔

ایرانی زبان کو دری و پہلوی بھی کہتے ہیں، لیکن ان ناموں کا تعلق زیادہ تر مقامات سے ہے جو لوگ کوہستانی علاقوں کے باشندے تھے۔ دروں میں رہتے تھے ان کی زبان کو دری کہنے لگے بعض کا خیال ہے کہ جب بہمن کے زمانے میں مختلف اطراف کے باشندے دربار میں آکر اپنی اپنی زبانوں میں اظہار خیال کرتے تھے تو ان کے سمجھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی ایسی مشترک زبان وضع کی جائے جسے سب سمجھ سکیں اور دربار شاہی میں اسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو زبان وضع ہوئی اسے دری (یعنی درگاہ سلطان کی زبان) کہنے لگے۔ لیکن یہ توجیہہ زیادہ قابل یقین نہیں ہے، اور صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ دری زبان کو دری اس لئے کہتے ہیں کہ وہ درہائے کوہ کے باشندوں کی زبان تھی۔

پہلوی زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شہر کے باشندوں کی زبان تھی۔ اور شہر کو پارسی میں پہلو کہتے بھی ہیں۔ اس لئے اسے پہلوی کہنے لگے۔ فردوسی نے اسے پہلوانی بھی ظاہر کیا ہے اور اس کے بعض الفاظ بھی استعمال کئے ہیں :-

کہ چوں پہلوانی سخن راندند ہمی گنگ در ہو شش خواندند

پہلوان کا مفہوم وہی ہے جو شہربان یا محافظِ شہر کا، اس لئے پہلوانی زبان سے بھی مراد وہی شہری یا پہلوی زبان ہے۔

---

(۳)

حسرت کے دو شعر

(عطاء الرب صدیقی بارلیسال)

حسرت موہانی نے اپنی اکثر غزلوں میں اپنے معشوق کے دکن کے قیام کے بارے میں لکھا ہے:۔

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

اس شاہدِ رعنا کے اکرام اقامت سے تقدیر چمک اٹھی اے ملکِ دکن تیری

مہربانی کرکے حسرت کے اس "نازنین" کی نشاندہی کیجئے۔

(نگار) ان اشعار میں اشارہ ہے سید ہاشم کی طرف جو کوڑا (فتحپور) کے رہنے والے تھے اور حسرت کے بڑے محبوب دوست تھے، میں بھی ان سے مل چکا ہوں۔ یہ بعد میں فتحپور سے حیدرآباد چلے گئے تھے اور غالباً وہیں وفات پائی۔

---

(۴)

مثنوی یوسف و زلیخا

(مرزا عرفان علی بیگ۔ لائل پور)

میں جاننا چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے مثنوی یوسف و زلیخا فارسی میں کس نے لکھی؟ میں نے یہاں کے ایک پروفیسر فارسی سے دریافت کیا تو انھوں نے فردوسی کا نام لیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟

میں ممنون ہوں گا اگر آپ تکلیف کرکے یہ بھی بتادیں کہ علاوہ فردوسی اور جامی کے دوسرے کن کن شعراء نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور آپ کی رائے میں سب سے بہتر تصنیف کس کی ہے؟

(نگار) عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے اور بعض تذکروں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی یوسف زلیخا سب سے پہلے فردوسی نے تصنیف کی

اور اسی بنا پر آپ کے پروفیسر صاحب نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔

یہ مثنوی سب سے پہلے ـــــ ابو موید بلخی نے لکھی جو اہواز کا متوطن اور فردوسی کی طرح خود بھی غزنوی عہد کا شاعر تھا۔ اس نے شاہنامہ بھی لکھا تھا۔

آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اسی قسم کی غلطی امین رازی مصنف تذکرۂ ہفت اقلیم نے بھی کی ہے جو لکھتا ہے کہ "مثنوی یوسف زلیخا سب سے پہلے شہاب الدین عمعق نے تصنیف کی جو دو بحروں میں پڑھی جاتی تھی" حالانکہ عمعق خضر خاں الک خانی فرمانروائے ترکستان کے دربار کا ملک الشعراء تھا اور فردوسی کے ڈیڑھ سو سال بعد اس کا انتقال ہوا۔

الغرض یوسف و زلیخا سب سے پہلے ابو موید بلخی نے نظم کی، اس کے بعد فردوسی نے اور پھر عمعق نے ... اس میں شک نہیں جامی کی یوسف و زلیخا بہت مشہور ہے اور بہترین نظم اس موضوع پر یہی ہے۔ لیکن یہ بات بہت بعد کی ہے کیونکہ عمعق و جامی کے درمیان تین صدی سے زیادہ کا بُعد ہے (عمعق کا انتقال ۵۴۳ھ میں ہوا اور جامی کا ۸۹۸ھ میں)

جامی کے بعد امیر ہمایوں نے اس قصہ کو نظم کیا (وفات ۹۷۹ھ) اور پھر ناظم ہراتی نے جو دربار عباسی قلی خاں شاملو امیر ہرات کے دربار کا شاعر تھا اور ۱۰۷۲ھ میں اس نے یہ مثنوی لکھی۔ اس کے بعد تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہ نام ہمارے سامنے آتے ہیں،

(۱) ملا شاہ محمد بن ملا عیدی (۱۰۷۲ھ)

(۲) حاجی لطف علی بیگ مصنف تذکرۂ آتشکدہ جس نے ۱۱۷۶ھ میں اس مثنوی کی تکمیل کی۔

(۳) شوکت جو فتح علی شاہ کے زمانہ میں ناظم شیراز تھا۔ اس نے ۱۲۳۶ھ میں تکمیل نظم کی۔

(۴) محمود بیگ فسونی (عہدِ جہانگیر و شاہ جہاں میں)

(۵) قاسم خاں موجی۔

(۶) یوسف بیگ خاں بخاری جن کے صحیح زمانہ کی تعیین مشکل ہے۔ لیکن یہ تھے بہت بعد کے شاعر۔

ریختہ میں مرزا جان طپش دہلوی نے اسے نظم کیا (وفات ۱۲۲۶ھ)

---

(۵)

بعض تذکروں کا سالِ تصنیف

(غلام ربانی عزیز۔ اسلامیہ کالج قصور)

مولانا

سلام مسنون۔ مندرجہ ذیل کتابیں فارسی شعراء کے تذکرے ہیں۔ اگر آپ از راہ کرم ان کے سالِ تصنیف کے متعلق اطلاع دے سکیں تو لطفِ گرامی کا ممنون ہوں گا۔

۱۔ خزانۂ عامرہ (آزاد بلگرامی)

۲۔ تذکرہ مردم دیدہ (حاکم علی حاکم)

۳۔ گل رعنا (شفیق اورنگ آبادی)

۴۔ سفینۂ ہندی (بھگوان داس)
۵۔ مخزن الغرائب (احمد علی)
۶۔ عقد ثریا (مصحفی)
۷۔ مجمع النفائس (سراج الدین آرزو)
۸۔ شمع انجمن (نواب صدیق حسن خاں)
۹۔ روز روشن (مظفر حسن صبا)
۱۰۔ گلستانِ مسرت (عبدالرحمن) شاکر

نیز یہ بھی دریافت طلب ہے کہ جس عہد میں خزانہ عامرہ۔ تذکرہ مردم دیدہ اور گل رعنا لکھی گئیں۔ آیا آپ کے علم میں ہے۔ کہ کوئی اور تذکرہ بھی لکھا گیا ہو۔ آپ نے اردو کا تذکرہ نمبر نکال کر بہت بڑا مفید کام سرانجام دیا ہے۔ اگر کسی فرصت میں فارسی والوں کی بھی مشکل کشائی فرمادیں۔ تو یہ کارنامہ بھی کچھ کم قدیں فرنہ ہوگا۔

(نگار) بہ تعمیل ارشاد ہر تذکرہ کا سال تصنیف اس کے نام کے سامنے درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ خزانہ عامرہ (آزاد بلگرامی) = ۱۱۷۶ھ
(آزاد ایک اور تذکرہ اس سے قبل سروِ آزاد کے نام سے ۱۱۶۵ھ میں مرتب کر چکے تھے)
۲۔ تذکرہ مردم دیدہ (حاکم علی حاکم) = (۱۱۷۵ھ = ۱۷۶۲ء)
۳۔ گل رعنا (شفیق اورنگ آبادی) = (۱۱۸۱ھ = ۱۷۶۷ء)
۴۔ سفینۂ ہندی (بھگوان داس) = (۱۲۱۹ھ = ۱۸۰۴ء)
۵۔ مخزن الغرائب (احمد علی) = (۱۲۱۸ھ = ۱۸۰۳ء)
احمد علی سندیلہ کے باشندہ تھے اور یہ تذکرہ اُنہوں نے صفدر جنگ کے نام سے منسوب کیا تھا۔ اور صفدر جنگ کی وفات ۱۱۶۷ھ میں ہوئی۔
۶۔ عقد ثریا (مصحفی) = یہ تذکرہ ۱۱۹۹ھ بہ مقام دہلی۔ قتیلؔ کے اصرار پر لکھا گیا تھا۔
۷۔ مجمع النفائس (سراج الدین خاں آرزو) = (۱۱۶۴ھ = ۱۷۵۰ء)
۸۔ شمع انجمن (نواب صدیق حسن خاں) = (۱۲۹۳ھ)
۹۔ روز روشن (مظفر حسین صبا) = (۱۲۹۵ھ = ۱۸۷۸ء)
۱۰۔ گلستان مسرت (عبدالرحمان) = ان کا تخلص شاکر تھا' اور عبدالمجید علی شاہ (لکھنؤ) میں یہ تذکرہ اُنھوں نے لکھا تھا اس لئے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۶۰ھ سے کچھ قبل کا ہوگا۔

جس زمانہ میں خزانۂ عامرہ۔ مردم دیدہ اور گل رعنا لکھے گئے۔ اس وقت کسی اور تذکرہ کی تصنیف

کا علم مجھے نہیں ہے اور غالباً کوئی قابل ذکر کتاب ایسی شایع بھی نہیں ہوئی۔

---

(۶)

سید علیم الدین صاحب - ایبٹ آباد

مجھے میر جملہ کے مختصر حالات درکار ہیں۔

(نگار) آپ کس میر جملہ کے حالات دریافت فرما رہے ہیں۔ تاریخ میں تین میر جملہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ بہرحال ان تینوں کے مختصر حالات یہ ہیں:-

(۱) میر محمد امین شہرستانی جو بہ عہد جہانگیر ۱۰۲۷ھ میں ہندوستان آیا اور دربار سے متوسل ہو گیا جہانگیر کے بعد عہد شاہجہاں میں اس کو پنج ہزاری منصب کے ساتھ میر جملہ کا لقب بھی عطا ہوا اور ۱۰۴۶ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(۲) میر محمد سعید، وزیر عبداللہ قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ کا۔ جو پہلے ہیروں کا تاجر اور بڑا دولت مند شخص تھا اور بعد کو اپنی دولت و فراست کی وجہ سے وزارت کے عہدہ تک پہونچ گیا۔ اور میر جملہ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ اس کا لڑکا محمد امین ایک اوباش قسم کا جوان تھا جس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ اس سے خفا ہو گیا اور اس کے باپ کے تعلقات بھی دربار دہلی سے خراب ہو گئے۔ بعد کو میر جملہ نے ۱۰۶۶ھ میں دہلی پہونچ کر شاہجہاں سے معافی طلب کی اور طبقۂ اُمرا میں شامل ہو گیا۔ اس کا اقتدار تخت نشینی اورنگ زیب کے وقت اتنا زیادہ ہو گیا کہ اسے سلطان شجاع کے تعاقب کے لئے مامور کیا گیا اور گورنر بنگال بنا دیا گیا اس کے ساتھ "معظم خانخاناں سپہ سالار" کا لقب بھی اسے ملا اور ہفت ہزاری امیر ہو گیا۔

اورنگ زیب کے چوتھے سال حکومت میں اسے آسام کی مہم پر روانہ کیا گیا اور یہ بہ آسانی آسام کی راجدھانی چرگاؤں پر قابض ہو گیا۔ لیکن اسی زمانہ میں بارش شروع ہو گئی اور آسام کے چاروں طرف پانی بھر گیا۔ اس سے آسام والوں نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ مغلیہ فوجوں کے ذرائع رسد رسانی کو بند کر دیا اور میر جملہ کی فوجیں بڑی دشواری سے بنگال واپس آئیں لیکن اس کے چند دن بعد ہی وہ بیمار ہو گیا اور خضر پور (کوچ بہار) میں انتقال کر گیا۔ (۱۰۷۳ھ)

(۳) تیسرا میر جملہ، فرخ سیر کا ایک محبوب امیر عبداللہ تھا جو کچھ دن صوبہ دار بہار بھی رہا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد وہ صدر الصدور بنا دیا گیا اور تیرہ سال کے بعد انتقال کر گیا (۱۱۴۱ھ)

---

(۷)

سید فضل حسین - کیمبلپور

ایک مصرعہ ہے:-

من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مصرع کس کا ہے اور اس غزل کے دوسرے اشعار کیا ہیں۔ ایک صاحب سے میں نے دریافت کیا تو انہوں نے خسرو بتایا، کیا یہ صحیح ہے؟

(نگار) یہ مصرع امیر خسرو کا نہیں بلکہ غلام علی آزاد بلگرامی کا ہے اور انہوں نے تذکرہ سرو آزاد میں اپنی یہ پوری غزل نقل کردی ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

دل از خیالِ مہوشے یک شہر ساماں در بغل — ایں شیشہ باشد دیدنی وارد چراغاں در بغل

روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ — من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

شہر نکویاں دیدہ ام خوانند درسِ حُسنِ خود — جائے کتاب آئینہ ہر طفل دبستاں در بغل

آزاد با ایں درد دل آرد اگر رو در چمن
پوشیدہ قمری را کند سرو خراماں در بغل

نگار کا سالنامہ

ہندی شاعری نمبر

جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ درج ہے۔ ساتھ ہی ہندی کے تمام اصناف شعری انکے موضوعات اور مباحث اور ساتھ ہی اردو شاعری سے تقابل اور تبصرہ پر سیر حاصل مقالات ہیں۔

ہندی کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو

اردو میں صرف یہی ایک مجموعہ ہے

شائقین ادب کے لئے یہ خاص نمبر مطالعہ کے لئے ضروری ہے

قیمت چار روپے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظومات

جنگل کا گلاب

فضا ابن فیضی

اب بھی ہوتی ہے یہ نامِ علم و فن "خنیا گری"
کیا ہوئے توڑے گئے جو چند طاؤس و رباب
ارتقائے فکر کے اس دورِ آسودہ میں بھی
تشنگی کا ہیں مداوا "شاہد و صہبائے ناب"
شہر کی گلیوں میں "علم خام" کے یہ مدرسے
زانوؤں پر اہلِ بینش کے یہ جادو کی کتاب
اپنے فن کاروں سے شرمندہ ہیں "قرطاس و قلم"
تجربے پختہ، نظر غائر نہ جذبے کامیاب
جھرّیاں افکار پر، احساس کے ماتھے پہ بل
اور کمہلائی ہوئی تخئیل کی آنکھوں کے خواب
پوچھ مت دیدہ دری کی رفعتیں، ہوتے ہیں اب
لفظ کی خلعت میں مشکل سے معانی باریاب
فن کی علت، فکر کی غایت، تخیّل کی جہت
یہ حقائق آجکل ہیں ایک دیوانے کا خواب
کر دیا ہے کاروبارِ شعر و دانش کے لئے
"نقرہ و نیلم" کا اربابِ نظر نے انتخاب
اف یہ عیبوں کی نمائش اور یہ اخفائے ہنر
زخم تو عریاں ہیں لیکن پھول ہیں زیرِ نقاب
وہ بلوغِ ذہن وہ ذوقِ دروں بینی کہاں
سنگریزوں نے کیا ہے بل کے ہیروں کو خراب
فکر و فن کے جائزے تشنہ، ادھورے تبصرے
مانگتی ہے آگہی اپنے سوالوں کا جواب
ہیں ادب کی مجلسیں "ایوانِ اربابِ نشاط"
شاعرانِ دہر ہیں "زخمہ زنِ سازِ شراب"
کیا یہی فنکار ہیں، شعر و ادب کی آبرو؟
کیا یہی مطرب رہیں گے اب نقیبِ انقلاب
کس فلک کی آبرو ہوں گے یہ بے نافہ غزال
کس افق کا نور ہوں گے بے سحر یہ آفتاب
کون اس محفل میں اپنی روشنی ضائع کرے
کون اُلٹے اپنے فکر و فن کے چہرے سے نقاب

میرے جلوے کا یہاں کوئی تماشائی نہیں — میں خود اپنی چشمِ بینا کا ہوں اک ناآہنگ خواب
میری اپنی انفرادیت ہے بس مجھ کو عزیز — خود ہی پیغمبر ہوں خود ہی معجزہ خود ہی کتاب

اس ہجومِ رنگ میں حیراں کھڑا ہوں اس طرح
جیسے جنگل میں ہو تنہا کوئی افسردہ گلاب

محبوب الرحمن وامق، عظیم آبادی

اگر سوکھ جاتے نہ آنکھوں کے سوتے — تو ہم بھی اک اشکوں کی مالا پروتے
جلاتے سرِ بزم داغوں کی شمعیں، — سرِ راہ تلووں میں کانٹے چبھوتے
اگر لوٹ جاتا کنارے سے طوفاں — سفینہ کو خود اپنے ہاتھوں ڈبوتے
یہ عمرِ رواں کاش اس طرح کٹتی، — کبھی تم کو پاتے، کبھی خود کو کھوتے
نہیں اس کا شکوہ کہ میرے نہیں تم — مگر اس جہاں میں کسی کے تو ہوتے
ہے کیوں ہم پہ الزام خود بحرِ عصیاں — نہ پایاب ہوتا نہ دامن بھگوتے
یہ محفل تو ہوگی مگر ہم نہ ہونگے — گجر بجتے بجتے سحر ہوتے ہوتے
ز سر تا قدم تم تو ہو رنگ و نکہت — کہاں تک تمہیں اپنے دل میں سموتے
غلط بخشیِ مے پہ ساقی سے کل شب — سرِ میکدہ رہ گئی ہوتے ہوتے

جنھیں ناخدائی کا دعویٰ تھا وامق
وہی کھا رہے ہیں سمندر میں غوطے[1]

شفقت کاظمی

یوں ختم کر چکے وہ رہ و رسمِ دوستی — جیسے ہم اُن کو یاد نہ آئیں گے پھر کبھی
تم نے تو خیر ایک نظر کا زیاں کیا — قسمت کسی غریب کی لیکن سنور گئی
دو دن کی زندگی میں اُٹھائے ہزار غم — دو دن کی زندگی بھی ہمیں خوش نہ آسکی
دامن چھڑا کے آپ تو چل بھی دیئے مگر — کچھ میں ہی جانتا ہوں جو دل پر گذر گئی
بیٹھے ہیں تھک کے راہ میں واماندگانِ شوق — با وصفِ جستجو تیری منزل نہ مل سکی
گذرا ہوں جب کبھی کسی پُرہول دشت سے — تصویر اپنے گھر کی نگاہوں میں پھر گئی

جب سے نظر پڑی ہے خطِ سرنوشت پر
شفقت کسی سے ہم کو شکایت نہیں رہی

فضا جالندھری

میں سوزِ عشق میں پاتا ہوں اک نئی لذت — جو ہو سکے تو چلے آؤ دل دکھانے کو
لبِ خاموش سے رہ رہ کے دھواں اُٹھتا ہے — ضبطِ اُلفت کی یہ تاکید ہے فریاد نہ ہو
کوئی اس سے کہہ دے ہنسی مدہوش نہ ہوئے — کلی پھول بن کر بکھر جائے گی،

---

[1] صوتی حیثیت سے یہ قافیہ نظم کیا گیا ہے جو اساتذہ قدیم کا دستور تھا۔

آج بھی ہے

جمیل مظہری

یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں آج بھی ہے
زندگی شیشہ فروشوں کی دکاں آج بھی ہے
کچھ نہ بدلے گا جو بدلا نہ عناصر کا مزاج
سنگ، شیشے کی طبیعت پہ گراں آج بھی ہے

پھول تھے خندہ بہ لب، خندہ بہ لب ہیں اب بھی
شمع تھی سوختہ جاں، سوختہ جاں آج بھی ہے
وہی شانہ ہے وہی پیچ و خم گیسوئے دہر
آئینہ جو نگراں تھا، نگراں آج بھی ہے

آج بھی شوق کی ہے گرمیٔ رفتار وہی،
عقل گردِ قدمِ راہرواں آج بھی ہے
اے جنوں تونے جو رستے میں اڑایا تھا غبار
گم اسی میں تیری منزل کا نشاں آج بھی ہے

مذہب اب بتکدۂ وہم و گماں ہو کہ نہ ہو،
مگر اک مدرسۂ سود و زیاں آج بھی ہے
یعنی اک سلسلۂ حلقۂ زنجیرِ ہوس،
حرم و دیر سے تا بابِ جناں آج بھی ہے

اہلِ نعمت کا محرّم بھی ہے عشرت آباد
عیدِ مفلس کی مزاجاً رمضاں آج بھی ہے
گوہرِ علم تھے ارزاں، سو ہیں اب بھی ارزاں
دانۂ گندم کا گراں تھا، سو گراں آج بھی ہے

لبِ ہر ریگ ہے اک تشنہ لبی کی تاریخ،
دلِ ہر ذرہ میں اک سوزِ نہاں آج بھی ہے
آج بھی فیضِ بلندی ہے بقدرِ شبنم
سینۂ پستی کا بہرحال تپاں آج بھی ہے

وہی چولھے ہیں، وہی راکھ، وہی آگ، جمیل
اور فضا میں جو دھواں تھا وہ دھواں آج بھی ہے

مطبوعات موصولہ

تاج محل

تصنیف ہے ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی کی جس میں فاضل مصنف نے تعمیر تاج محل کی پوری تاریخ قلمبند کردی ہے۔ یہ کتاب ۹۵ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سب سے پہلے اُنہوں نے ہندوستان کی اسلامی تعمیرات اور مغل فن تعمیر پر مورخانہ گفتگو کرتے ہوئے وسط ایشیا کی تعمیرات سے اس کے تعلق پر گفتگو کی ہے اور پھر عہد شاہجہاں کی تمام تعمیرات کا ذکر کیا ہے جو آگرہ، لاہور، کشمیر، کابل و دہلی میں پائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد اُنہوں نے تعمیر تاج محل کی پوری تاریخ پیش کی ہے۔ اور اسقدر جامع و مکمل کہ اس سے زیادہ تکمیل کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اُنہوں نے اس تعمیر کے ہر ہر حصہ کا نام لیکر اس کی تعمیری خصوصیات، نقش و نگار، اور کتبات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے معماروں، نقاشوں، کاتبوں، منتظمین اور اخراجات و مصارف کی تفصیل بتائی ہے اور اس قدر کاوش و قدغن کے ساتھ کہ اس مشہور عالم تعمیر کے ایک ایک ذرہ کی داستان ہمارے سامنے آگئی ہے۔ فاضل مصنف کو اس کتاب کی تدوین کے لئے ۱۴۴ کتابوں اور صحائف کا غائر مطالعہ کرنا پڑا ہے، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی تالیف میں مصنف نے کتنی محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔

اس نوع کی تصانیف حد درجہ محتاج ہوتی ہیں اس بات کی کہ ان کے ساتھ نقوش و تصاویر بھی شائع کی جائیں، سو اس لحاظ سے بھی یہ تصنیف اپنا جواب نہیں رکھتی، کیونکہ اس میں ۷۶ تصاویر بھی شامل ہیں، جن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عہد مغلیہ کے فن تعمیر کی عظمت و اہمیت کا راز کیا تھا۔

یہ کتاب نہایت دبیز کاغذ پر بڑے اہتمام سے مجلد شائع کی گئی ہے اور دس روپیہ میں کتاب خانہ نورس کبیر اسٹریٹ لاہور سے مل سکتی ہے۔

جماعت اسلامی کا کردار

تصنیف ہے جناب چودھری حبیب احمد صاحب کی جس میں جماعت اسلامی کی تحریک اور اس کے مقاصد کا جائزہ لینے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کتاب اس مخصوص نظریہ کے لحاظ سے بہت تشنہ و نامکمل ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک پروپاگنڈا ہے، اس جماعت کے بانی و موسس کے خلاف جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا مودودی کا مقصود دراصل اصلاح مذہب و اخلاق نہیں بلکہ مذہب کی راہ سے سیاست پاکستان میں اپنی جگہ پیدا کرنا اور حصول اقتدار ہے۔

مودودی تعلیمات کے سلسلہ میں اُنہوں نے اس جماعت کے مذہبی اصول یا اس کی تعلیم اسلام کو اتنا سامنے نہیں رکھا جتنا ان اقوال کو جو سیاست پاکستان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی وقت قیام پاکستان کے مخالف تھے، یا یہ کہ کشمیر کے باب میں فوجی اقدام کو اُنہوں نے اسلامی جنگ یا جہاد تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اسی سلسلہ میں ان کے بعض متضاد نظریوں اور اقوال کو بھی پیش کیا گیا ہے جو فقہی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل مقصود تو یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ پاکستان کے مخالف ہیں اور اس مخالفت کے سلسلہ میں وہ بیرونی امداد بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔

جس حد تک ان الزامات کا تعلق ہے، اسکی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کی تردید اسلامی جماعت ہی کا فرض ہے، لیکن جس حد تک نفس تعلیم اسلام کا تعلق ہے، اس پر ضرور رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ چودھری صاحب نے اس پہلو پر کوئی گفتگو نہیں کی، کیونکہ اول تو یہ بات شاید

ان کے بس کی بھی نہ تھی اور دوسرے یہ کہ ان کا مقصود زیادہ تر اس جماعت کے سیاسی رجحانات کو قابل اعتراض ثابت کرنا تھا۔

مودودی لٹریچر میں یقیناً ہم کو بعض باتیں ایسی بھی ملتی ہیں جو ذہن انسانی کو اپیل کرتی ہیں، لیکن وہی ذہن انسانی جو روایتی مذہب اور مذہبی روایات و معتقدات کا پہلے ہی سے قایل ہے، اور وہ شخص جو اسلام کے اُصول اور اس کے معتقدات کا پابند نہیں ہے وہ اس لٹریچر سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے مذہب کو عقلیت کے حدود تک کھینچ لانے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے روایات کو قابل یقین بنانے کی کوشش ضرور کی، لیکن عقل و درایت کے اس پہلو کو چھوڑ دیا جس کا آغاز ہی روایات کے انکار سے ہوتا ہے۔

بہرحال جس حد تک روایتی مذہب کا تعلق ہے اُنھوں نے اس کے اصلاح کی کوشش ضرور کی اور بعض خس و خاشاک کو دور بھی کیا، لیکن عقلی اجتہاد سے کبھی کام نہیں لیا اور نہ وہ غالباً اس پر راضی ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ سودا دل کا نہیں بلکہ سر کا ہے۔ خیر یہ چند باتیں تو میں نے ضمناً درج کر دیں اور وہ بھی اس لئے کہ اگر چودھری صاحب آیندہ اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہیں تو سب سے پہلے اسی بنیادی سوال کو سامنے رکھیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ مقصود ان کا پہلے بھی نہ تھا اور غالباً آیندہ بھی وہ اس خارزار سے گزرنا پسند نہ کریں گے۔ ان کا مدعا تو صرف سیاسی حیثیت سے اس تحریک کو غلط اور مخدوش ثابت کرنا تھا، سو معلوم نہیں وہ اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں، کیونکہ ممکن ہے اسلامی جماعت ان الزامات کی تردید کی کوشش کرے یا ان کی کوئی قابل قبول تاویل پیش کر سکے۔

یہ کتاب خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہے اور پانچ روپیہ میں پاکستان ٹائمز پریس لاہور سے مل سکتی ہے۔

چراغ دیر و حرم

مجموعہ ہے ڈاکٹر صفدر حسین کی غزلوں کا جو ماضی بعید و ماضی قریب دونوں زمانوں کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ ہر چند اُنہوں نے اس مجموعہ کی ترتیب اسی تفریق زمانی کے لحاظ سے کی ہے، لیکن مجھے تو ان کی شاعری کے یہ دونوں زمانے ایک ہی سے نظر آتے ہیں۔ جیسے جوان (صالح یا غیر صالح ہونے کا سوال نہیں) وہ ماضی بعید میں تھے ویسے ہی ماضی قریب میں بھی رہے اور غالباً مستقبل میں بھی وہ ایسے ہی رہیں گے۔ فرق اگر ہو سکتا ہے تو صرف لب و لہجہ کا۔ جذبات کا نہیں اور تغزل نام ہے صرف جذبات کا۔

ڈاکٹر صفدر حسین اپنے علمی اکتسابات کے لحاظ سے جتنے اونچے انسان ہیں، اتنے ہی بلند وہ اپنے ذوق و اخلاق کے لحاظ سے بھی ہیں۔ نہایت سنجیدہ و متین، حد درجہ شایستہ و نستعلیق اور اسی کے ساتھ ساتھ بہت ذہین و شوخ طبع بھی۔ اور یہی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صفدر کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ اب سے کچھ دن پہلے ان کی نظموں کا مجموعہ رقص طاؤس شایع ہو چکا ہے جو آزاد نظم نگاری کا بڑا دلکش نمونہ ہے۔ اور اب غزلوں کا مجموعہ "چراغ دیر و حرم" ہمارے سامنے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس میں وہ شاعر بھی ہیں، نقاش بھی اور اس میں وہ خالص شاعر ہیں۔ یعنی جیسا کہ خود اُنھوں نے ظاہر کیا ہے:۔

طائر آزاد صفدر زیر دام آ ہی گیا

اور اس میں شک نہیں اُنھوں نے اپنی یہ داستان اسیری بڑی خوبی سے بیان کی ہے۔

ڈاکٹر صفدر کی غزلوں کا رنگ یکسر کلاسیکی ہے۔ فکر و تکنک دونوں حیثیتوں سے، اس لئے غزل گوئی کی وسیع تاریخ میں جو صدیوں تک پھیلی ہوئی ہے عہد حاضر کے کسی غزل گو شاعر کا کوئی مقام متعین کرنا بڑا دشوار امر ہے، تاہم اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ڈاکٹر صفدر، واردات و جذبات کی شاعری پر پوری قدرت رکھتے ہیں جس میں اسلوب بیان اور الفاظ کے نکھار نے بڑی تازگی پیدا کر دی ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب حال دل ہے یہ تو کسی غم کا کیا سوال | اب یہ خوشی کا بھی متحمل نہیں رہا
طاقت صبر ہے یارائے شکیبائی ہے | پھر بھی پردے نے نہ اٹھنے کی قسم کھائی ہے
ہم سے پوچھو ان کی نظروں کا فسونِ التفات | درد باقی ہے مگر دل کو قرار آ ہی گیا
بخشی ہے دل کے زخم کو تیرے خیال نے، | وہ تازگی کہ جانِ تمنا کہیں جسے،
اسی سے کوئی اذیت کی لذتیں پوچھے | جو بدنصیب کبھی بار یاب ہو نہ سکا
پڑی ہے جب بھی نظر چاک جیب و داماں پر | خود اپنے حال پر ہم مسکرائے ہیں کیا کیا

یہ مجموعہ بڑے اہتمام سے مجلد شایع کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپیہ

ناشر:- بارگاہ ادب ۵/۲۴۲ ڈرگ روڈ کالونی - کراچی ۲۵

زرگل مجموعہ ہے ایک خاتون "عظمت عبدالقیوم خاں" کی غزلوں اور نظموں کا۔ ابتداء میں انھوں نے مختصراً اپنے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیدر آباد کے کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور وہیں کے ادبی ماحول میں ان کا نشوونما ہوا۔ اُنھوں نے اپنے ذوق کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ شعر کو تفسیر حیات سمجھتی ہیں اور یہی سمجھ کر اُنھوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ لیکن جب تک اس قدم رکھنے کی کوئی تاریخ متعین نہ ہو، ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کا یہ سفر کب شروع ہوا تھا۔ اپنے سوانح میں ان کا تاریخ ولادت کے اظہار سے گریز کرنا بڑی عجیب بات۔ لیکن چونکہ عمر کے بارہ میں دوسروں کو مشکوک رکھنا عورت کی فطرت ہے، اس لئے چنداں قابل اعتراض بھی نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی پختہ عمر کی خاتون ہیں اور یہ بات کچھ تو میں نے ان کی عبارت انتساب سے سمجھی اور کچھ ان کے کلام سے۔ یہ مجموعہ ان کی ۵۲ غزلوں اور ۱۸ نظموں پر مشتمل ہے، غزلیں یکسر کلاسکل عاشقانہ رنگ کی ہیں لیکن بہت سنجیدہ و پاکیزہ۔ نظمیں عام مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں اور کافی وزنی و خیال انگیز ہیں۔

غزلوں کے بعض اشعار جن سے ان کی ندرت فکر پر کافی روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہوں:

چراغ کس نے جلایا ہے راہِ عظمت میں | مجھے تلاش تھی جس کی کہیں وہی تو نہیں
تمہید لطف خاص تھا جو میرے واسطے | وہ عہد اہتمام جفا یاد آ گیا
ہائے یہ بات اُجالوں کو ابھی کیا معلوم | رات کس طرح سے گزری ہے سحر سے پہلے
واعظ حقیقتاً ہے محبت اگر گناہ | محفوظ ہوں ندامت ترکِ گناہ سے
یہ التفات ناز بہت خوب ہے مگر | دل کہہ رہا ہے تیری جفا اور بڑھ گئی،
بہاریں مسکرائیں چاند نکلا گیت لہرائے | وہ جب آئے تو اُن کے ساتھ ساری دلکشی آئی
جب تک تمہارے لطف و کرم کا یقین تھا | آلام روزگار میں بھی دلکشی رہی

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کہنے والا کوئی نوآموز شاعر نہیں ہے، بلکہ وہ غزل کی ان تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے جو فکر صالح کے لئے ضروری ہیں۔

ان کی نظموں میں جوش و ولولہ زیادہ نمایاں ہے اور کہیں کہیں بڑی لطیف شاعرانہ تعبیرات سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً "تلخ" کے عنوان سے جو نظم اُنھوں نے لکھی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

وفا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا حسین آنسو — کسی کے جذبۂ صادق کا ایک نذرانہ
تصورات کی دنیا کی دلنواز سحر — جہان عشق کا ایک شاہکار افسانہ

ڈھلا ہے قالب مرمریں نغمۂ دلکش — لطافتوں میں تری اک جہاں اُجالوں کا

بہرحال اس میں شک نہیں کہ عظمت کی شاعری پر اُن کے تخلص کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

قیمت چار روپیہ - پتہ - خیابان - امیرپیٹھ - حیدرآباد دکن۔

تصانیفِ مولانا نیاز فتحپوری

انتقادیات

مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی، ہر مقالہ اپنی جگہ حرفِ آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے 'اُردو زبان' اُردو شاعری' غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ قیمت چار روپے ۵۰ پیسے۔

مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ

مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہبِ عالم کی ابتداء، مذہب کا فلسفہ و ارتقاء مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت:- ایک روپیہ ۷۵ پیسے

مشکلاتِ غالب

غالب کے تمام مشکل اشعار اُردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت دو روپے

عرضِ نغمہ

ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ جو نایاب ہوگیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ مع ایک بسیط مقدمہ کے۔ قیمت:- ایک روپیہ

تاریخ کے گمشدہ اوراق

حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں' ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت:- دو روپے

جذباتِ بھاشا

مولانا نیاز فتحپوری نے ایک عجیب انداز تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کرکے انکی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۲۰ پیسے

منیجر:- نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

عنقریب شائع
نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ
کیا جا رہا ہے

ماجدولین نمبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے
ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی !!
اِسے پہاڑوں نے سُنا اور کانپ اُٹھے
زمین نے سُنا اور تھرا اُٹھی ٭ خدا نے سُنا اور تا دیر ملول رہا۔ اے نہ
جسے روح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

محبت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں۔
اور یہ ممکن نہیں
یہ سانحہ پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔

قیمت:۔ تین روپے ۳

نگارِ پاکستان ٭ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ٭ کراچی ۳

غیر ضروری اور فاضل اخراجات کو روک کر بچائی ہوئی رقم

اسٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ

میں جمع کیجئے

ایک سیونگز بنک اکاونٹ صرف پانچ روپے سے بھی کھلوا سکتے اور اعلیٰ درجہ کی بنکاری خدمات سے پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

آج ھی آپ

ہماری کسی بھی شاخ میں اپنا اکاونٹ کھولئے اور ھماری معیاری خدمات سے فائدے اٹھائیے۔

یاد رکھئے "اسٹینڈرڈ" اعلیٰ معیار خدمت کا نام ہے

ہیڈ آفس
محمدی ہاؤس۔ کراچی

اے میکلین
جنرل منیجر

S.B.L 1964/11

یکتا